غالب کے نئے خطوط
انور سدید

ڈاکٹر وزیر آغا کا خط انور سدید کے نام

برادرم، السلام علیکم

اِن دنوں "اوراق" کے سلسلے میں بے حد مصروف ہوں کل کچھ فرصت ملی تو سوچا کہ آپ کا بھیجا ہُوا "غالب کے نئے خطوط" کا مسوّدہ ذرا اُلٹ پلٹ کر دیکھوں۔ بس اتنا یاد ہے کہ میں نے غالب کے پہلے خط کا پہلا ورق پڑھنے کی کوشش کی تھی؛ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں کہ کیا ہُوا۔ دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص میرے شانوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر مجھے محویت کے عالم سے نکال رہا ہے۔ جھنجوڑنے والے نے بتایا کہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے مجھے کتاب کے سحر سے باہر نکالنے میں مصروف ہے۔ بہرحال اس وقت تک میں پُوری کتاب پڑھ چکا تھا۔

اب اس کے بارے میں کیا کہوں۔ میں نے اِنشائیہ نگاروں کی صفِ اوّل میں آپ کا شمار کیا تھا۔ اب مجبور ہوں کہ طنز و مزاح لکھنے والوں کی صفِ اوّل میں بھی شمار کروں کتاب میں طنز اتنی لطیف اور مہذّب ہے اور مزاح اِتنا سبک اور فراواں کہ ہونٹ جب ایک بار تبسم میں بھیگ جاتے ہیں تو کتاب کے اِختتام تک بھیگے ہی رہتے ہیں۔ سلیم نے یہ بات مجھے بتائی ہے کہ کتاب پڑھتے ہُوئے میں سارا عرصہ مسکراتا رہا۔ اور درمیان میں کئی بار بے اِختیار ہو کر ہنس پڑتا تھا۔

انور صاحب!

میں نجومی تو نہیں ہوں مگر میرا خیال ہے کہ آپ کی یہ کتاب بہت پسند کی جائے گی۔ ممکن ہے آپ کی اور میری زندگی میں ایسا نہ ہو، کیونکہ اس میں بہت سے معاصرین زد میں آئے ہیں لیکن اس کے بعد، یقینی طور پر! ہمارے ہاں چھوٹی چھوٹی تحریفیں تو لکھی گئی ہیں، کتاب سائز کی یہ غالباً پہلی پیروڈی (تحریف) ہے۔

وزیر آغا

۲۹ر جنوری ۱۹۸۲ء

سرگودھا

غالب کے نئے خطوط

○

انور سدید

مکتبہ اُردو زبان ○ ریلوے روڈ ○ سرگودھا

بہ ضابطہ

تعداد	۵۰۰
طبع	اوّل
ناشر	نُصرت انوار
کتابت	صغیر احمد خاں شروانی
مطبع	مکتبۂ جدید پریس لاہور
طابع	چوہدری رشید احمد
سرورق	موجد بشیر
سالِ اشاعت	۱۹۸۲
قیمت	۳۰ بتیس روپے

ماہنامہ "تخلیق" لاہور

کے

مدیران

عذرا اصغر اور اظہر جاوید

کے نام

جنھوں نے "غالب کے نئے خطوط" ماہنامہ "تخلیق" میں شائع کئے
اور پتھر کھانے میں میرے ساتھ شریک ہوئے

کچھ مصنّف کے بارے میں

✿✿✿✿✿
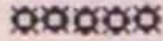
نام: انور سدید

پیدائش: ۴ر دسمبر ۱۹۲۸ء

مقام: میانی ضلع سرگودھا

تعلیم: ایم اے، پی۔ایچ۔ڈی (پنجاب یونیورسٹی) سول انجینیرنگ میں گریجوایٹ

کاروبارِحیات: سائنس کا عملی شعبہ سول انجینیرنگ (ایگزیکٹو انجینیر آب پاشی)

✿✿

تصنیفات و تالیفات

۱۔ فکروخیال	تنقید
۲۔ اختلافات	تنقید
۳۔ اقبال کے کلاسیکی نقوش	تنقید و تحقیق
۴۔ اُردو ادب کی تحریکیں.......مقالہ پی۔ایچ۔ڈی (زیرطبع)	
۵۔ اُردو افسانے میں دیہات کی پیشکش	تنقید
۶۔ رادھے شیام کے نام ایک بزرگ کی بیاض	
۷۔ راجہ مہدی کی آخری نظمیں مقدمہ و انتخاب	
۸۔ بہترین ادب انتخاب دو جلدیں	
۹۔ بہترین نظمیں انتخاب دو جلدیں	
۱۰۔ ذکر اس پری وش کا انشائیے	

✿✿✿

۱۱۔ میرانیس کی قلمرو	تنقیدِ انیس
۱۲۔ غالب کی اقلیم	تنقیدِ غالب

✿✿✿✿✿✿✿

اس کتاب میں

نقشِ فریادی

میں غالب فہم ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا، غالب آشنا ضرور ہوں، غالب کا معاملہ تو یہ ہے کہ زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر کبھی نہ کبھی ہر ذی شعور کی ضرورت بنا ہے، اور ہم اہلِ دل کی تو بات ہی الگ ہے ـــــ غالب نے کتنی مشکلیں آسان کی ہیں، کبھی کبھی محبّت کی بات کرتے ہوئے لفظ شرمائے تو غالب کے کسی مصرعے یا شعر نے سہارا دیا ـــــ خط لکھتے ہوئے معنیٰ آفرینی کا مرحلہ آیا تو غالب نے ساتھ دیا ـــــ کالم لکھے تو شعروں کے شعر مواد مہیا کرتے رہے، مگر سچ تو یہ ہے کہ غالب کے خط نہ پہلے کبھی کام آئے، نہ اب میرے حق میں جا رہے ہیں۔

غالب کی زبان، اس کا بیان، لہجے کی نُدرت، الفاظ کی بُنت، اِظہار کی قُدرت اور اسلوب کی جدّت...... اتنی بے شمار خُوبیاں میرے کم مایہ قلم سے کبھی سمیٹی ہی نہیں گئیں، اور ذہن کی گرفت میں کبھی آئی ہی نہیں؛ ـــــ اس پر انور سدید نے کرم (یا ستم) یہ کیا کہ غالب کے خط (پیروڈی) کے ردِّ عمل میں میرے نام غالب کا خط لکھ مارا۔ میں ان دنوں "تخلیق" کا مدیر تھا (یا دشِ بخیر) اور بزعمِ خود ادب کے سب حلقوں اور ادیبوں کے سب گروپوں کا

مرزا اسد اللہ خاں غالب

—— پ۔ ۱۷۹۷ء

انور سدید

—— پ۔ ۱۹۲۸ء

مکتوب غالب بنام نواب کلب علی خاں

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے حضرت کا رونق افزائے کلکتہ ہونا از روئے شمار رفتار ریل یقینی ہے مگر وہاں کے آب و ہوا کا موافق آنا اور جناب لارڈ صاحب بہادر سے ملاقات کا ہونا اور اجلاس کونسل کا وقوع میں آنا یہ امور جب تک حضرت رقم نہ فرمائینگے دعاگو کی خیال میں کیونکر آئینگے ناچار جرأت بہم پہنچا کر اس عرضداشت کے جواب میں ان حالات کے انکشاف کا امیدوار ہوں۔ دیگر قدیم حضرت کے تصدق سے قرض ادا ہو گیا تنخواہ اپنی قسط سے اور میں نے رنج سے رہائی پائی ہم بدل و ہم بزبان ثنا خوان جود و نوال و دعاگوئے دوام دولت و اقبال ہوں۔ آدھا قرض عطیۂ سابق میں اور آدھا قرض عطیۂ حال میں ادا ہو گیا کہہ نہیں سکتا اور بن کہی بنتی نہیں اگر میرے لڑکوں کا پچاس روپیہ مہینا جنوری سنہ ۶۲ء یعنی ماہ حال و سال حال سے جاری ہو جائیگا اور ماہ بماہ فقیر کے روزینہ کے ساتھ پہنچا کریگا تو آپکا شکرگزار پھر کبھی قرضدار نہو گا زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب
[illegible] جنوری
[illegible]

غالب کا خط اظہر جاوید کے نام

میری جان اظہر جاوید،

ناسازیِ طبیعت و بے ربطیِ اطوار، بہ طریق داغ بالائے داغ آرزوئے دیدار در آتش شرارہ بار اور رنگِ دریائے ناپیدا کنار ــ "تخلیقِ ناہموار" کہ میرے لئے قطرۂ رفتار اور دشمنوں کی آنکھوں میں خار ہے، لعبت ترک و اقتدام یہاں پہنچا، ورق ورق پر تمہاری محبت کی مہر کندہ اور لفظ لفظ میں خلوص کی بوئے جاں نوازی ہویدا ہے، تم نامۂ غالب بخط جلی لعبت ناز چھاپتے ہو، خود داد دیتے ہو، دوسروں کو داد پر اکساتے ہو، گویا مجھے حیات جاوید عطا کرتے ہو، فقیر غالب کا ہر بن مو تمہارے احسان کا شکر گزار ہے۔ یہ تمہاری مروت کا نشان، میرے پاس عمر میں ایک اور سہی

....

نیاز مند تھا ــــ پھر یوں ہوا کہ خواب کے منظر کی طرح سب کچھ بدلنے لگا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ میرے خواب ٹوٹنے لگے، خوش فہمیاں، تڑخنے لگیں اور سارے بھرم کھلتے گئے۔ ــــ وہ "اہلِ ظرف" جن سے برسہا برس سے دوستی اور نیاز مندی کا تعلق تھا پہلے کسمساتے، جز بز ہوئے، ناراضی کا اظہار کیا اور آخر قطع تعلق کر لیا۔ اور یوں کیا کہ اپنے تمام حلقۂ اثر اور دائرۂ اختیار میں اعلان کر دیا کہ یہ شخص معتوب ہے، ناپسندیدہ ہے، گردن زدنی ہے، پھر کسی نے گالی دی، کسی نے الزام کا پتھر مارا اور کسی نے معاشرتی مقاطعے کا پروگرام بنایا۔

عجیب بات ہے ادب کا دعویٰ داغنے والے، طنز و مزاح سے ناتا جوڑنے والے اور دوسروں پر تنقید کرنے والے خود کتنے تنگ دل ہو جاتے ہیں، اس کا اندازہ پہلے نہ تھا ــــ "غالب کا خط" ــــ مستقل چھپنے لگا اور ذرا سی طنز کی سوئی چبھنے لگی اور مزاح کی چٹکی لی جانے لگی تو "دوستوں" نے شکایت کی۔ میں نے عرض کی:

"آپ سب اظہارِ رائے کی آزادی کے علم بردار ہیں، جواب لکھیں، من و عن چھپ جائے گا۔"

مگر کسی نے میری دلیل نہ مانی، اپیل نہ سُنی، ــــ بس یہی حکم ہوتا رہا کہ ہم سے دوستی عزیز ہے تو "غالب کا خط" بند کر دو۔

ایمان کی بات ہے کہ اگر غالب کے خط میں کبھی ادب سے ہٹ کر ذاتیات پر حملہ ہوتا تو میں ضرور اس حکم کی تعمیل کرتا۔ لیکن گذارش تو اتنی ہے کہ طنز و مزاح لکھنے والوں کو طنز و مزاح سہنے اور قبول کرنے کی ہمت بھی پیدا کرنی چاہئے۔

ــــ "تخلیق" کے قارئین نہیں جانتے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ بے شمار دوستوں کی خوشنودی کے لیے بیشتر اوقات انور سدید کے کئی تیز اور چلبلے جملے کاٹنے پڑے، ان کا ڈنک نکالنا پڑا۔

اس سب کے باوجود میں موردِ الزام ٹھہرا ــــ آدھا شہر ناراض ہوا اور حلقہ حلقہ، قریہ قریہ میری "گستاخیوں" کے تذکرے چلنے لگے۔ "غالب کا خط" کا ادب میں کیا مقام بنتا ہے؟ یہ منصب آج کے نقاد اور کل کے مؤرخ کا ہے ــــ میری فریاد تو اتنی ہے کہ میں

مفت میں مارا گیا ہوں۔

کچھ عرصہ پہلے میں "تخلیق" سے بے تعلق ہوا تھا تو خیال تھا کہ کچھ "رفع شر" ہو جائے گا، تکدر ڈھل جائے گا، مگر نہ غالب کے خطوں میں تعطل آیا نہ چتونوں کے بل سیدھے ہوئے، بلکہ اب "تخلیق" کی مدیرہ اعلیٰ عذرا اصغر بھی میرے ساتھ اس بوچھاڑ کی زد میں ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کا قول ہے کہ

"سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ تم کسی پر وہ عیب لگاؤ جو خود تم میں موجود ہے۔"

سو میں اپنا معاملہ خُدا پر اور غالب اور انور سدید کا فیصلہ وقت پر چھوڑتا ہوں کہ مجھے خُدا کی ذات اور وقت کے عمل پر کبھی شک نہیں ہوا۔

جہاں تک انور سدید کا تعلق ہے تو انھوں نے غالب کے اسلوب کو نبھانے اور اپنا رنگ جمانے کی خوبصورت کوشش کی ہے، اور اس میں وہ بہت کامیاب رہے ہیں، بہت سے لوگوں کی نکتہ چینی کرنے اور مین میخ نکالنے کے باوجود "تخلیق" کے پڑھنے والوں نے اسے بہت پسند کیا اور انور سدید کے اندازِ تحریر کو سراہا۔ اگر کبھی کوئی خط چھپنے سے رہ گیا تو دسیوں سوال ہوئے، بیسیوں لوگوں نے استفسار کیا۔ یوں انور سدید کے قلم کو توانائی ملی اور ہمارا یہ احساس راسخ ہوا کہ ادب کو ادب جان کر پڑھنے والے بے شمار قارئین ابھی موجود ہیں، جو نہ کسی گروپ سے وابستہ ہیں، نہ کسی تعصب کی عینک لگائے ہوئے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ یہی ہمارے ساتھی ہیں۔

یہی انور سدید کے مخاطب ہیں۔

اظہر جاوید

مدیر اعزازی ماہنامہ "تخلیق" لاہور

رُوبرُو

سچ پوچھئے تو خود مجھے بھی معلوم نہیں کہ اس کتاب کی وجہِ تالیف کیا ہے، بعض کتابیں ایک مخصوص منصوبہ بندی کے تحت لکھی جاتی ہیں اور مقصود خلقِ خُدا کی بھلائی ہوتا ہے۔ اس قسم کی کتابیں فرازِ خیال سے خود نہیں اُترتیں بلکہ انھیں قوتِ دماغ کے بل بوتے پر اتارا جاتا ہے۔ اور ان میں کششِ ثقل زیادہ پیدا کی جاتی ہے۔ چنانچہ ان کے مطالب و مفاہیم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے گہری کھدائی کرنی پڑتی ہے۔ اس کے برعکس کتابوں کی ایک قسم ایسی بھی ہے۔ جس میں بقول مرزا غالبؔ مضامین غیب سے آتے ہیں اور صریرِ خامہ نوائے سروش بن جاتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب غالبؔ کی تعریف پر پوری نہیں اترتی۔ تاہم اسے اوّل الذکر قسم کی کتابوں میں شامل کرنا بھی شاید مناسب نہیں، وجہ یہ کہ اس کتاب کی تالیف میں کسی منصوبہ بندی کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اور اس کی ترتیب میں خلقِ خُدا کی فلاح و بہبُود کا کوئی زاویہ پوشیدہ نہیں، یہ کتاب ایک لالۂ خودرو کی طرح پیدا ہوئی۔ بعض دوستوں نے اس سلسلے کو پسند کیا اور پھر ایک ہی شاخ پر متعدد نئے پھول اُگتے چلے گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ جناب اظہر جاوید نے اپنے موقّر ماہنامہ "تخلیق" میں جناب علی مقصود حمیدی

کا ایک خط غالب کے اسلوبِ نگارش میں شائع کیا۔ میں اس خط کے بعض مندرجات سے اتفاق نہ کر سکا۔ ایک اضطراری ردِّ عمل کے تحت میں نے اس کا جواب غالب ہی کے اسلوب میں لکھ بھیجا۔ اظہر جاوید کی اس خوبی کو ان کے "دشمن" بھی سراہتے ہیں کہ وہ "ثقہ مدیرانِ گرامی" کی طرح ادیب اور اس کی تخلیق کے درمیان سدِّ سکندری نہیں بنتے۔ وہ تخلیق کو قوم کی امانت تصوّر کرتے ہیں اور اسے کسی "خیانتِ مجرمانہ" کے بغیر قاری تک پہنچا دیتے ہیں، انہوں نے میرے اس مکتوب کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا اور پھر جو داد اور بے داد وصول ہوئی اسے بھی شائع کیا۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ صریرِ خامہ "نوائے عصر" بن گئی ہے۔ اس قسم کے دوستوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، سجّاد نقوی اور عطاء الحق قاسمی پیش پیش تھے، سجّاد نقوی صاحب کا خیال تھا "اگر غالب اس زمانے میں زندہ ہوتا تو عصرِ حاضر کے مسائلِ ادب پر اسی طرح ردِّ عمل ظاہر کرتا"۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے فرمایا: "غالب تو اب بھی زندہ ہے اور وہ اس عہد کو دیکھ ہی نہیں رہا، بلکہ اس کا اعمال نامہ بھی مرتّب کر رہا ہے"۔ اس تحسینِ سخن شناس نے میرے اظہار کے اس نئے اسلوب کو اعتماد بخشا اور یوں "تخلیق" کی ہر اشاعت میں "مرزا غالب" "جناب اظہر جاوید" سے ہم کلام ہوتا رہا۔ اور ایک نیا مکتوب تخلیق ہوتا چلا گیا۔ بعض دوستوں نے اس سلسلے کو اپنے رسائل میں جاری کرنے کی دعوت دی لیکن "غالب" چونکہ اظہر جاوید کی محبت میں گرفتار تھا، اس لیے اسے یہ سلسلہ کسی اور پرچے میں منتقل کرنا غیر مناسب معلوم ہوا۔

زیرِ نظر کتاب میں جس صنفِ ادب کو آزمانے کی کوشش کی گئی ہے وہ بلا شبہ پیروڈی ہے اور اس کا ماڈل غالب کے لازوال خطوط ہیں۔ میں نے اس پیروڈی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے غالب سے ہی استفادہ کیا ہے اور خطوطِ غالب سے ایسے بے شمار ٹکڑے اقتباس کئے ہیں جنھیں موجودہ زمانے کے ادبی مسائل اور شخصیات پر آسانی سے منطبق کیا جا سکتا ہے چنانچہ ان خطوط کا بیشتر حصّہ غالب سے مستفاد ہے میں نے ضرورتِ تازہ کے تحت حرف ان کی ترتیب یا مقامِ ظہور بدلنے کی جسارت کی ہے۔

غالب کے ذاتی خطوط میں اس کی پہلودار شخصیت کے بہت سے دلآویز نقوش موجود

ہیں۔ وہ ہمہ تن محبت بھی ہے۔ اور اس کے ہاں نفرت کا شدید جذبہ بھی موجود ہے۔ اس کے ہاں ضبط و تحمل کی نہایت بھی ملتی ہے لیکن بعض اوقات اس کے ہر بُنِ مُو سے غُصّہ پھوٹتا ہوا بھی نظر آتا ہے۔ وہ اپنی انا کو تحفظ مہیا کرتا ہے اور اسے کبھی شکست خوردہ دیکھنے کی تمنا نہیں کرتا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ زندگی کی مادی ضرورتیں جب مجبور کر دیتی ہیں تو وہ خودی اور خودداری کو برقرار نہیں رکھ سکتا اور گھٹیا قسم کی خوشامد پر بھی اُتر آتا ہے۔ بے نیازی اور تغافل اس کی فطرت ہے اور لمحے سے اکتسابِ مسرت کرنا اس کا مزاج۔ وہ زندگی کو متاعِ گراں مایہ تصور کرتا ہے لیکن موت سے گریزاں نہیں اور اس منزل کو جواں مردی سے سر کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ میں نے اس محشرِ خیال اور مجموعۂ اضدادِ شخصیت کے بیشتر نقوش کو اس کتاب میں قائم رکھنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ چنانچہ "غالب کے نئے خطوط" میں اگرچہ واقعاتِ زمانہ کا تناظر تبدیل ہوگیا ہے لیکن ان میں آپ کو وہ غالب یقیناً زندہ نظر آئے گا جس نے اپنی انا کو تحفظ دیا۔ دوستوں کی دلداری کی، غمِ مرگ، غمِ رزق، غمِ عزت اور غمِ فراق کو برداشت کیا، زندگی کی مشکلات کے آگے سینہ سپر رہا۔ اس کی آنکھوں میں نامساعد حالات کے باوجود شرارت کی چمک آویزاں ہے اور وہ مسکراہٹوں کی تقسیم بے دریغ کر رہا ہے۔

"غالب کے نئے خطوط" میں غالب کی چشمِ نگراں کو اہمیت دی گئی ہے۔ وہ ہمارے عہد کی گوناں گوں ناہمواریوں پر خندہ زن ہے اور شخصیتوں پر طنز کے وار کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ خطوط شائع ہوتے تو بعض دوستوں کی جبینوں پر بَل پڑ گئے اور چند ایک تو دشنام کی قرولی نکال کر مصنّف کے علاوہ "تخلیق" اور مدیرانِ "تخلیق" پر بھی حملہ زن ہو گئے۔ ہم سب نے یہ تمام وار خندہ پیشانی سے برداشت کئے اور "پرورشِ لوح و قلم" سے ہاتھ نہ کھینچا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اہلِ ادب نے نہ صرف "غالب" کو قبول کر لیا بلکہ مُدیرانِ "تخلیق" سے اِن خطوط کی اشاعت کا مسلسل تقاضا بھی کرنے لگے۔ اِن خطوط کو اب کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے تو مجھے یقین ہے کہ عصرِ حاضر کے واقعات پر "غالب" کے شیریں اور تُرش ردِّ عمل کو نسبتاً کشادہ نظری سے قبول کیا جائے گا۔

ماہ نامہ "تخلیق" نے اِن خطوط کی اوّلیں اشاعت کی اور ان کے لیے ایک قابلِ

عزت حلقۂ قرأت پیدا کیا، محترمہ عذرا اصغر اور محترم اظہر جاوید میرے ساتھ پتھر کھانے میں برابر کے شریک رہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اِن خطوط کی داد اپنے منفرد شگفتہ انداز میں دی اور "غالب" کو اس عہد کا محتسب قرار دیا کہ وہ بالائی سطح سے سب کچھ دیکھتا ہے اور پھر اس کا اظہار بلاخوف و خطر کر دیتا ہے۔ سجاد نقوی صاحب کے بے ساختہ قہقہے نے اس کتاب کے مطالب و معانی کو رونق بخشی، ایک صاحب شوخ چشمی سے اس تمام عمل کو دیکھتے اور زیرِلب مُسکراتے رہے۔ ان کا اسمِ گرامی جناب غلام جیلانی اصغر ہے اور میرا ان سے نیازمندی کا رشتہ ہے۔ پرویز بزمی اور راغب شکیب کا کرم یہ تھا کہ نیا خط لکھنے میں دیر ہو جاتی تو وہ یاددہانی کی مہمیز استعمال کرنے سے گریز نہ کرتے، میں ان سب اصحاب کا تہِ دل سے شکر گذار ہوں، آخر میں مجھے مکتبہ اُردو زبان کے ناشر کا ذکر بھی کرنا ہے جو پس منظر سے دکھائی نہیں دیتا لیکن اس کتاب کے ہر لفظ میں موجود ہے۔ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت کا دُکھ برداشت کیا۔ میں اس کے لیے ان کا شکر گذار ہوں۔

کوٹ اَدو

۲۶ر اگست ۱۹۸۱ء

انور سدید

۱

برخوردار سعادت واقبال نشان اظہر جاوید کو میری دُعا پہنچے۔

کیوں بھائی! میں اس لائق نہیں تھا کہ ایک نسخہ "تخلیق" کا بہ سبیلِ ڈاک خاص میرے واسطے بھیجتے۔ کل آخر روز منشی ہرگوپال الموسوم بہ میرزا تفتہ تمھارا جریدہ لایا۔ میں نے دیکھا۔ آنکھوں سے لگایا۔ بینائی کمزور ہے۔ مطالعہ کسی اور وقت پر اُٹھایا۔ اور پرچہ بہ سبیل احتیاط طاق پر رکھ دیا۔ تفتہ یہ دیکھ کر سٹپٹایا۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اتنے میں بھائی فضلو جن کو میر کاظم علی بھی کہتے ہیں اور ہم نے احتلام الدّولہ خطاب دیا ہے۔ دو تین پاؤ کھجوریں اور ایک ٹین کا لوٹا اور دو سوت کی رسیاں لے کر بھٹیارے کے ٹٹو پر سوار بغرضِ سفر جاتے دکھائی دیے۔ میرے پاس بہر ملاقات آ گئے، لیکن اس صورت کہ باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ آتے ہی تمھارا جریدہ کھول میری کمزور آنکھوں کے سامنے کیا۔ میں نے علی مقصود حمیدی کا خط پڑھا....... اور جان گیا کہ میرزا تفتہ کیوں تلملاتا ہے۔

بھائی! مجلہ "پاکستانی ادب میں" خضر کا خط رئیسِ سخن رئیس امروہوی ثم کراچوی کے نام میں نے پڑھا تھا۔ تمھیں معلوم ہو کہ فقیر خضر نے بیسویں صدی کے رُبع سوم میں میرے طرزِ سخن کو مکرر جاری کیا۔ اپنی باتوں کو میرے انداز میں بیان کیا۔ سبحان اللہ! رموزِ ادب میں اکثر اس کو اپنا ہم طالع

اور ہم خیال پایا۔ میرا ہم قلم تو سراسر قلمرو ہندوستان و پاکستان میں نہیں۔ مگر ہاں اس نے ہنسی مذاق، طنز، بذلہ، مزاح اور جگت کا اچھا معیار قائم کیا۔ بات سے بات نکالی۔ اور خوب نکالی۔ اگرچہ طول کلام کا شکار رہا۔ لیکن میں جی سے خوش ہوا، عزیزوں کی ستم کیشی اور رشتہ داروں کی ناخوشی کو بھول کر فقیر خضر کو دعا دی کہ موردِ ستم ہائے روزگار ہو کر ہنسی خوشی کا موقع پیدا کرتا ہے۔

پھر علی مقصود حمیدی کیوں رنجیدہ ہوا۔ اور اس نے دامنِ ضبط اور دامنِ اخلاق کیوں دریدہ کیا کیا لکھوں ؟ امور نفسانی میں اضداد کا جمع ہونا محالاتِ عادیہ میں سے ہے۔ کیوں کر ہو سکے کہ ایک وقتِ خاص میں ایک امرِ خاص موجب انشراح کا بھی ہو اور باعثِ انقباض بھی۔ یہ بات میں نے تمہارا مجلّہ "تخلیق" دیکھ کر پائی کہ اس کو پڑھ کر خوش بھی ہوا اور غمگین بھی۔ سبحان اللہ کیسے کیسے مضمونوں کے نگینے تم نے جمع کئے۔ شاعروں کے معنوی تعارف کرائے۔ شاعرات کی صوری ملاقاتیں بہم پہنچائیں۔ روزنامہ بخاری اور ثریا قریشی سے مل کر دل خوش ہوا۔ ان کی طرح دار نظمیں اور وضعدار تبصرے سب اچھے لگے۔ بھائی ! اُردو ادب تمہارا احسان مند ہے کہ تم تخلیق کے ساتھ تصویر بھی چھاپتے ہو۔ اور ویران بساطِ ادب کو حسینانِ زرنگار سے جلوہ آرا کر دیتے ہو۔ اور جو کبھی مجھ بوڑھے کھوسٹ کی تصویر چھاپ دو تو لوگ بالیقین رسالہ تمہارا نذرِ آتش کر دیں۔ ہے ہے ہے۔ زنہار زنہار یہ نہ کرنا۔ سنا تم نے یہ امر خوشی کا تھا۔ اب تم پوچھو کہ باعثِ انقباض کیا بات ہوئی ؟

پہلے ایک قاعدہ کلّیہ دلّی کا سمجھ لو، خالق کی قدرت مقتضی اس بات کی ہے کہ جو اس شہر پناہ کے اندر پیدا ہوا، مرد ہو یا عورت اخفقان و مراق کا غلغپاڑہ ہے۔ میاں۔ یہ ردِّ عمل نہیں۔ محض خفقان ہے۔ مجھے تو یہ حضرت بیمار نظر آتے ہیں۔

جو شخص مزاح کی لطافت کو نہ سمجھے اور شائستگی سے مسکرا نہ سکے مجھے اس کی صحت پر کیوں شک نہ ہو۔ محبِ مکرم رئیس امروہوی نے پڑھا ہو گا تو اس نادان دوست کی جسارت پر ضرور رو دیا ہو گا کہ ظالم نے خواہ مخواہ فقیر خضر کو موردِ دشنام بنایا۔ اور بالجبر ادب کو ثقاہت کے معیار سے گرایا۔ کم بخت نے شکوہ کرنا نہیں سیکھا۔ کبھی میرے پاس آتے تو میں اسے یہ باب بالاستیعاب پڑھاؤں۔ خفقان سے ظاہر ہے کہ وہ دلّی میں پیدا نہیں ہوا تو یہ شہر پناہ ضرور دیکھی ہے۔ بس اس بات پر ختم کرتا ہوں۔ لیکن پوچھتا ہوں کہ تم نے یہ خرافات درج اخبار کیوں کی اور

اپنے جریدے پر رُسوائی کیوں چپکائی۔ اور اگر جو دل برداشتہ ہو کر فقیر خضر نے قلم توڑ دیا تو یہ نقصان کس کا ہوگا۔ اب مناسب امر یہ ہے کہ فقیر خضر سے معذرت خواہی اس دُشنامِ بے جا پر کرو اور حج اکبر کا ثواب لو۔

اب میرا حال سنو۔ خلد آباد میں تعظیم و توقیر میری بہت ہے۔ پاکستان اور ہندوستان سے جو شاعر، ادیب، مصوّر، افسانہ خواں، سنگ تراش، فلسفہ دان اور داستان طرازمنہ موڑ کر یہاں آتا ہے۔ پہلے میرے غریب خانے پر حاضری دیتا ہے۔ ایک مکان کہ وہ تین چار کمروں پر مشتمل ہے رہنے کو ملا ہے۔ اور یہ مرجعِ خاص و عام ..... بنا ہوا ہے۔ چند روز ہوئے بہزاد کی معیت میں عبد الرحمٰن چغتائی اور رشا کر علی آئے۔ اس وقت سے مغل فنِ مصوّری اور تجریدی مُصوّری پر بحثیں جاری ہیں۔ اب شفقت کاظمی قدم آرا ہوئے ہیں اور ہاں یہ جو تم نے صفحۂ اوّل پر ایک جوانِ رعنا نسیم شمائل پوری کی تصویر چھاپی ہے۔ اور اندرونِ صفحات لندن میں اس کی موت کی خبر گرم کی ہے۔ وہ یہاں کے کس محلے میں آباد ہوا ہے۔ اس کی ناگہانی وفات سے مجھے نواب زین العابدین عارف یاد آگیا۔ ایک اور چرکہ دل پر لگا گیا۔ اس جوانمرگ کا پتہ مجھ کو بھیجو اور جو نہ بھیج سکو تو میرا پتہ اُسے بتادو، یہ تو میرا ہم خیال اور ہم مشرب نظر آتا ہے۔ اپنے ساتھ ضرور دو چار بوتلیں عرقِ انگلسیہ کی لایا ہوگا۔ جنت الفردوس میں اس کے ساتھ مل بیٹھنے کو جی چاہتا ہے، حوروں اور غلمانوں کی صحبت سے اکتا چکا ہوں۔ واللہ باللہ!

تم نے مناوزیر آغا نے اب لاہور کو اپنا مسکن بنایا؟ سرگودھا ویران اور شامِ دوستاں برباد ہوگئی۔ غلام جیلانی اصغر اب اپنے کالج کے بچّوں کے تیور ٹھیک کر رہا ہے۔ سجاد نقوی بیچوانِ مرید سے دل بہلا رہا ہے۔ جمیل یوسف راولپنڈی اور کراچی اور لاہور کے زہرہ جمالوں کو ملتفت کرنے میں مصروف ہے۔ انور سدید غالب سے غالب تک غیر مدوّن حالت میں چھوڑ چھاڑ "تحریکوں" کے مطالعے میں کھو گیا ہے۔ مونسِ دیرینہ ڈاکٹر سہیل بخاری ملازمت سرکار سے ریٹائر ہو گیا اور ایک مکان دلکشا۔ گلشن کی سیر، روشنیوں کا تماشا، تین چار کشادہ کمرے، آتشدان، صحن وسیع کہ مملوکہ سرکار تھا اور

نگماں ہر چند یارِ غار تھا۔ اس کو چھوڑ کر ایک مکان تنگ گلی کے اندر لیا ہے۔ دروازے پر ایک کتا وحشت مزاج مالک مکان کا موجود، ڈیوڑھی پر حلال خوروں کا مجمع، تاش کی بازی، شطرنج کی بساط، گو کے ڈھیر۔ کہیں حلال خور کا بچہ ہگ رہا ہے، کہیں بھینس کا گوبر، کہیں کوڑا پڑا ہوا ہے۔ عیاذاً باللہ۔ خدا اللہ ہے جانے اس مکان میں۔ سنا ہے ڈاکٹر سہیل بخاری کی جان ضیق میں ہے۔ تمام عمر ادب کی ریاضت کی اب زندگی اس ریاضت کا بدلہ لے رہی ہے۔

تم نے اپنی غزلوں کا مسودہ کیوں نہیں بھیجا۔ بھائی اپنا دیوان مرتب کر ڈالو۔ تقریظ کی خدمت گذاری کو میں آمادہ ہوں۔ سرورق پر کی رائے احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا سے لکھواؤ۔ عالمِ بالا میں مشہور یہ ہے کہ ایک دوسرے کی ضد میں لکھتے ہیں۔ ایک قاطع دوسرا برہانِ قاطع۔ تبصرہ اچھا لکھتے ہیں۔ تنقید کا حق ادا کرتے ہیں۔ لیکن اپنے نظریے پر قطب مینار کی طرح قائم۔ مصنف کا بھی تھوڑا بہت چرچا ہوتا ہے — وزیر آغا تو بحث کو خوب چٹکاتے ہیں۔ تین چار مقالے انھوں نے میرے کلام پر بھی لکھے۔ جی خوش ہوا۔ وفورِ شوق سے کورنش بجالایا۔ مجھے مکرر زندگی ملی — تمہارا پرچہ دیکھا۔ میں نے فوراً خط لکھا۔ وَالسّلام مع الاکرام

نگاشتہ: از اسد اللہ خاں غالب

بست و دوم۔ اپریل ۱۹۷۵ء

۲

جانِ من و جانانِ من! اظہر جاوید سلمکم اللہ تعالیٰ۔

منگل کے پانچویں اگست کو تین گھڑی دن رہے ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ ایک مہربانی نامہ علی گڑھ سے اور ایک سرگودھا سے ہمراہ ایک پرزہ کاغذ کہ اس پر نام تمہارا مرقوم تھا ہم رشتہ خط لایا۔ لِلّٰہ الشکر۔ یہ امر خوشی کا تھا۔ لیکن ڈاک کا ہرکارہ متاسّف، پریشان اور میں حیران۔ تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقعہ ہوا۔ تمہاری سعادتمندی کو ہزار ہزار آفرین تم کو یوں ہی چاہیئے تھا۔ لیکن میں نے تو ایک بات بطریقِ تمنّا لکھی تھی۔ تم نے مجلّہ "تخلیق" سب ساکنانِ جنّت کو بہ تکلّف پارسل بنا کر بھیجا۔ لاہور سے دہلی اور خلد آباد تک ٹھیک پہنچا۔ لیکن حکّام نے مالِ تجارت سمجھا اور روک لیا۔ مجھے صرف اطلاع نامہ بھیجا۔

اب میں کیا کہوں، دل مسوسا گیا۔ نامۂ دوست خوشبوئے عنبریں لایا لیکن دسترس نہیں۔ صاحب! وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم تم میں معاملاتِ مہر و محبت تھے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔ ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ کیا۔

آموں کی ٹوکریاں بھیجیں۔ سنگتروں کے صندوقچے ارسال کئے۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط، تمہارا رسالہ حکّام بے ادب نے روکا، مجھ کو بہت رنج ہوا۔ حالانکہ میرا ہونا شہر میں سب جانتے ہیں۔ شعر، ادب، لیکور اور شطرنج سے مجھے شغف ہے۔ پیشۂ آبا سپاہ گری تھا لیکن اب وہ موقوف۔ تجارت کا نشان سو پشت تک کہیں نہیں ملتا۔ میں نے عرض گذاری کہ یہ مالِ تجارت نہیں میرے حبیب لبیب اظہر جاوید کا ارمغان ادب "تخلیق" ہے اور خلدآباد کے اہلِ ذوق میں مفت تقسیم ہوگا۔ اس پر چیف کمشنر کی تصدیق ہوئی۔ ایک رسالہ واگذار باقی سب بحقِ سرکار ضبط ہوا۔ دریافت کیا: "اندرونِ سلطنتِ ہندوستان و پاکستان و خلدآباد ادبی رسائل بر سبیل ڈاک بھیجنا اگر از روئے معاہدہ شملہ ممنوع ہے تو اس کا بالراست اعلان کیوں نہیں ہوا۔ رسالہ کے پہنچنے اور پھر واگزار نہ کرنے کی اطلاع سے سرکار میرا دل کیوں رنجیدہ کرتی ہے"۔ اس کا جواب ہنوز نہیں ملا۔ سنا ہے کہ اربابِ حرفہ نے ڈاک کی رعایت کا ناجائز فائدہ اُٹھایا اور تمام پوچ کتابیں، کوڑا کرکٹ اِدھر کا اُدھر اور اُدھر کا اِدھر لا پھینکا۔ چاوڑی میں اور دریبے میں اور حوض قاضی اور جامع مسجد کے آس پاس "دھنک" اور "ملن" اور "مصوّر" اور جاسوسی و جنسی ڈائجسٹ سرِعام بکتے ہیں۔ اوراق، سیپ، تخلیق، افکار اور نیرنگِ خیال کی صورت نظر نہیں آتی۔ سنا ہے کہ پاکستان میں "شمع" اور "شبستان" اور "روبی" بہت مقبول ہیں۔ خاص و عام بہ شوق خریدتے اور چھپا چھپا کر رکھتے ہیں۔ ہیہات ہیہات!

رسالہ تمہارا آبِ زمزم تھا۔ میں نے قطرہ قطرہ تقسیم کیا۔ میر مہدی مجروح۔ مرزا تفتہ۔ نواب شیفتہ۔ مولانا مہر غرضیکہ سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور پڑھا۔ مجید امجد کے باب میں لوگوں نے کیا خبر مشہور کی ہے کہ مرنے سے پہلے ترقی پسند ہوگیا تھا؟ بھائی۔ یہ جزا ہے یا سزا آفرین ہے یا نفرین۔ قہر ہے یا لطف۔ عدل ہے یا ظلم۔ اس پر قہر بر جانِ درویش ———

مجید امجد کو عباس اطہر اور انیس ناگی اور افتخار جالب کی محفل میں بٹھایا۔ ایک ورق پر اس کا تذکرہ تھا۔ میں نے مجید امجد کی نذر کیا۔ موصوف یحییٰ امجد کے نام پر رکا۔ ٹھٹکا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے یہ ورق بغور نہیں دیکھا تھا۔ دوبارہ پڑھا۔ آخری اقتباس میں اڑھائی مصرعے مجید امجد کے۔ وہ بیچارہ فریادی تھا۔ صاحبِ مضمون نے یحییٰ امجد کو مستقبل کی آواز کہا۔ سبحان اللہ میں نے دلجوئی

میں کہا

"اے میاں ملال کیوں کرتے ہو۔ وفات کے بعد شاعر کا کلام مثل متروکہ جائداد کے ہوتا ہے جس کا جی چاہے اڑائے اور یحییٰ امجد میں تو نصف جز ہی مجید امجد کا ہے۔ اسے زیادہ حق تھا سو اس نے کیا بُرا کیا۔ میرا حال سنو۔ کلام میرا اب تک شاعروں میں بٹ رہا ہے۔ کس کس نے دیوانِ غالب سے استفادہ نہیں کیا۔ بڑے بڑے شاعروں کو پڑھو۔ سچ مچ میرا حلیہ ہے۔ واہ۔ اب کیا شاعری رہ گئی ہے۔ جو شخص وزن بحر اور آہنگ پر قادر نہیں وہ نثری نظم لکھتا ہے۔ مستقبل کی آوازوں میں شمار ہوتا ہے۔ میاں خوش ہو تمھاری آواز مستقبل میں پہنچی اور تمھیں چاہنے والے پیدا ہوئے۔ پھر کیوں واویلا کرتے ہو؟"

مجید امجد درویش آدمی ہے۔ نہ آبِ انگور نہ عرقِ انگلسیہ، صبر و تسلیم و توکل و رضا شیوہ صوفیا کا ہے اور یہ سب اس میں موجود۔ میری دلجوئی سے خوش ہوا۔ اور تمھاری طرف سے دل اس کا صاف ہوا۔ سنا ہے بقیدِ حیات تھا تو تم نے خواجہ زکریا کو مامور کیا اور اس کا انٹرویو چھاپا۔ شہرت اس کی دور دور ہوئی۔ "قند" نے مکرر چھاپا۔ لیکن وہ پرچہ مجھے نہیں ملا۔ تاج سعید کو میرا اسلام کہنا اور مبارکباد دینا۔ خبردار بھول نہ جائیو کہ یہ سلام روستائی بغیر مطلب نہیں۔ وہ مجید امجد کا کلام چھاپ رہا ہے۔ کیا خبر میرا کلام چھاپنے پر بھی مائل ہو جائے۔ یہ شخص مذکور زیاں کا کاروبار کرتا ہے۔ اور خوب کرتا ہے واہ وا ــــــ کسی نے مجھ سے ذکر کیا کہ لاہور میں انشائیہ کی بحث پھر جاری ہو گئی ہے۔ کسی ستم ظریف نے مجھے اوّلین انشائیہ نگار کہا ہے۔ میرے خطوط اردو زبان میں دیکھ کر ان کو یہ گمان ہوا۔ ہزار بار کہوں صد ہزار بار کہوں کہ یہ بہتانِ عظیم ہے اور جو اس میں شک کرے وہ کافر۔ ہمارے زمانے میں انشائیہ نہیں تھا۔ ہاں میری طرز و روش خط کی نئی تھی۔ خط کیا تھا آپس کی گفتگو۔ میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ ہزار کوس سے مجانِ قلم سے باتیں کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ جیسے تم میرے سامنے خلد آباد میں بیٹھے ہو۔ میں تم سے باتیں کر رہا ہوں۔ تم سُن رہے ہو۔ بھائی انشائیہ بعد کی ایجاد ہے۔ واللہ باللہ اس اقلیم کی بادشاہت وزیر آغا کو ملی ہے۔ خواجہ حسن نظامی، پطرس بخاری، صلاح الدین احمد،

ناصر نذیر فراق، مہدی افادی، فلک پیما، یلدرم، تاج، مہر اور سالک سب اسے تسلیم کرتے ہیں اور جو کوئی اس صنفِ سخن کی ایجاد کا تاج کسی اور کے سر پر رکھے اسے جعلی سمجھنا کہ یہ غوغائے شب خمنے ہے۔

پر میاں تم نے اندرونِ جلد شیریں جالوں، ناہید خصالوں اور راحت غزالوں کی محفل میں جوہر نظامی، انور سدید اور زمان کنجاہی کھوسٹ مردوں کو کیوں لا بٹھایا۔ یہ لوگ دھوکا کرتے ہیں۔ بڑھاپے میں جوانی کی تصویریں چھپواتے ہیں اور جو بتانِ مغاں شیوہ میں شرکت جوانوں کی لازم تھی تو میری تصویر شامل کرتے۔ اختر امان کو چھاپتے۔ یوسف کامران اور فخر زمان کو جگہ دیتے اور نہیں تو اپنی تصویر چھاپتے۔ جی خوش ہوتا۔ "باغِ جناح کی ایک سازش" کا احوال کھلتا۔ اب کس سے پوچھوں۔ کسی روز تنویر نقوی سے دریافت کروں گا۔ قلندر چہ گوید۔

تمہارا غصہ سر آنکھوں پر، واللہ یہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔ ذکر تمہارا اس محفل میں ہر وقت ہوتا ہے اور میں تمہاری باتوں سے خوب لطف اٹھاتا ہوں۔ کل شام مرزا تفتہ کہیں سے اخبار امروز لائے۔ اس میں تمہارا بیان پڑھا۔ پیر و مرشد احمد ندیم قاسمی نے ادب کا رشتہ باکسنگ سے جوڑا اور تم نے محمد صفدر میر کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ جی خوش ہوا اب اپنا اقتباس پڑھو۔

"سن ۴۹ یا ۵۰ کے لگ بھگ احمد ندیم قاسمی لاہور کے ایک ادبی پرچے کے مرتب تھے۔ اس میں اپنے ترقی پسند ساتھیوں کے چہرے لکھتے ہوئے انھوں نے کچھ اس طرح لکھا تھا:

"محمد صفدر میر بمبئی سے لاہور آگیا ہے اور اس نے رجعت پسندوں کو للکارا ہے جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں گڑبڑ کرنے آتے ہیں کہ میں صرف ادیب ہی نہیں باکسر بھی ہوں سو اب ذرا سوچ کر ادھر کا رُخ کرنا۔۔۔۔"

میں نے آبا کی سپاہ گری پر فخر کیا۔ صفدر میر خود باکسر ہے کیوں فخر نہ کرے۔ ماشاءاللہ ایں سعادت بزورِ بازو است! ۔۔۔ اور اب اس طویل بیان کا دوسرا حصہ بھی سنو جس

میں تم نے تضاد پیدا کیا اور مجھے لطفِ کمال حاصل ہوا۔

"ایک عرصے کے بعد کسی محفل میں اتنی گھما گھمی اور بھرپور حاضری کا منظر دیکھا۔ دلچسپ لطیفہ یہ ہوا کہ اس ریستوران میں پولیس والوں کی وائرلیس گاڑیاں صفدر میر اور کچھ دوسرے دانشوروں کی کاروں کے پاس آکر رکیں اور سپاہی اور اعلیٰ افسر وردیوں میں ملبوس ریستوران میں داخل ہوتے تو ذہن میں برسوں پہلے کے مناظر گھوم گئے ......"

واہ وا۔ مکرر واہ وا میاں۔ واضح ہو کہ یہاں تم نے بیان اپنا ادھورا چھوڑا ہے .... بتاؤ تو بھلا کونسا منظر تمھارے ذہن میں گھوما؟ اور کونسا محمد صفدر تمھیں اچھا لگا۔ باکسر محمد صفدر میر یا وہ محمد صفدر جس کے اوپر پولیس اور نیچے کار تھی۔ اور میں یہ بھی پوچھتا ہوں کہ ادیب کو کار تک پہنچنے کے لیے کیا باکسر بننا ضروری ہے؟

ہاں یہ تم ترقی پسند مصنفین کی مخالفت پر کیوں اتر آتے ہو۔ اوپر کے بیان پر غور کرو اور اب دیکھو کہ "تخلیق" میں پروفیسر زمرد ملک کا مندرجہ ذیل اقتباس مذکورہ صدر بیان کا لاحقہ ہے۔

"پاکستانی دانشور کو کسی صورت معاف نہیں کیا جا سکتا۔ قریب قریب ہر دانشور نے برسرِ اقتدار جماعت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہمارے دیکھتے دیکھتے جو کچھ اب تک کیا ہے ہمارے سامنے ہے اور ان کی موقع پرستیوں اور ضمیر فروشیوں نے جہاں ان کو سرفراز کیا۔ وہاں ان کی حرکات نے قومی کردار کو اس قدر مجروح کیا کہ اب اجتماعی سطح پر ہم سب بے ضمیر اور بے بصیرت ہو چکے ہیں۔"

میاں۔ اس بے ضمیری کا مجرم میں ہوں۔ تمھارا شکر گذار ہوں۔ فقیر کو پاکستان کے حالات میں اپنا چہرہ دکھایا۔ میں نے سرکار انگلیسہ میں خوشامد اور مدح گستری کی۔ جب کوئی نواب گورنر جنرل بہادر نئے آتے میری طرف سے ایک قصیدہ بطریق نذر جاتا۔ قسمت یاوری کرتی تو سکتر بہادر گورنمنٹ کا خط اس کی رسید میں بر سبیلِ ڈاک پاتا۔ از راہِ قدردانی القاب میں اضافہ ہوتا۔ اس اعتبار سے بندۂ ناچیز ملک ہند کا پہلا ترقی پسند ٹھہرا۔ لیکن یہ امر وجہ مسرت نہیں باعث ندامت ہے۔ اس علت بے جا میں بھی وکٹوریہ، فٹن اور بگھی کی حسرت پوری نہ ہوئی اور اب متاسف ہوں۔ زیادہ کیا لکھوں۔ اے کاش جانتا تو لٹاتا نہ گھر کو میں۔

نجات کا طالب
غالب

۳

کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ میرزا اظہر جاوید!

خط کا سرنامہ پڑھ کر تم ضرور چونکے ہو گے۔ پہلے مجھ سے حقیقت پوچھو۔ غالبؔ کثیر المطالب کی وضاحت دریافت کرو۔ ہرگوپال تفتہ پیدائشی ہندو، کثرت پرست ہے۔ پر میرا دوست اور یار اور دلبند ہے۔ میں نے اسے مثل اپنے فرزند کے جانا اور میاں کہا۔ میرزا کہا۔ یہ میری محبت ہے۔ مذہب کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ منشی شیو نرائن آرام نے میرے خط چھاپے۔ آپس کے معاملات اور دل پر ظاہر کئے۔ ہر چند ان کا چھاپنا خلافِ طبع تھا۔ لیکن اہلِ علم نے زرہِ قدر دانی میرے خطوں کو سر پر رکھا اور میری نثر کو آنکھوں سے لگایا۔ دل سے سراہا۔ میں نے شیو نرائن کو دعا دی اور اپنا فرزندِ دل بند کہا۔ اب یہی کام تم کرتے ہو تو کیوں نہ تمہیں میر کہوں میرزا کہوں، بھائی کہوں، بیٹا کہوں۔

میاں اظہر جاوید! یہ سب القاب محبت کے ہیں اور میرے وفورِ محبت کا برا نہ ماننا۔

امجد اسلام امجد نے پیر و مرشد احمد ندیم قاسمی کو نقّاد کہا ہے۔ کیا انھوں نے برا مانا؟ بہ سبیل حیل یہ بات تم سے دریافت کرتا ہوں!

تمھارا خط اور تین پرچے "تخلیق" کے پہنچے۔ شاید میرے دکھانے کے واسطے بھیجے گئے ہیں۔ اس وقت ذوالفقار علی بخاری اور ڈاکٹر محمود حسین کہ تازہ واردانِ خلدآباد ہیں میرے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے ایک ایک پرچہ ان کی خدمت میں پیش کیا اور تمھاری تعریف کی کہ لاہور میں "حلقۂ اربابِ ذوق" کے قریب بیٹھ کر میرے نام منگواتا ہے اور حسنِ کتابت اور خلوص و مہر سے چھاپتا ہے۔ پھر پرچہ کھول کر دیکھا۔ واہ وا۔ میاں اظہر جاوید۔ تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔ نثر میں خود نمائی کرنے لگے۔ بھائی، "اپنی بات" جو تخلیق کا پہلا ورق ہے پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ اُردو عبارت لکھنے کا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا۔ تم تو اُردو کے قتیل بن گئے ہو۔ راوی کے کنارے رہتے رہتے رودِ نیل بن گئے ہو، کیا قتیل کیا رودِ نیل۔ سب ہنسی کی باتیں ہیں۔ کئی دن سے تمھارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں۔ آج لکھنے کا قصد کیا ہے۔ مگر حیران ہوں کہ کیا سحر طرازی کروں، جو سخن پردازی کروں۔

بھائی! نسیان کا مرض عرصہ دراز سے مجھ پر وارد ہے۔ مبادا بھول جاؤں۔ لہٰذا واضح ہو کہ اس دفعہ غزلیں تم نے لاجواب چھاپی ہیں۔ بالکل میرے مذہبِ ادب کے مطابق فکر و خیال سے آراستہ، لُغت، محاورہ اور اصطلاح کی پابند!

بزمِ جوش و مستی میں صورتِ فغاں تنہا	اے ہجومِ یاراں کیوں میں ہوں نگہباں تنہا
خارزارِ ہستی میں ہر قدم نئی منزل	دل خراب و واماندہ خستہ نیم جاں تنہا

صاحب! یہ شاعری نہیں کرامت ہے۔ اعجاز ہے، آفریں صد ہزار آفریں۔ یہ طرزِ نگارش خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم لاہوری الموسوم بہ شیخ آفتاب احمد لوٹ لے گیا۔ اللہ برکت مزید دے۔

پنشن کے باب میں تمھیں میں نے کچھ نہیں لکھا۔ تم اہلِ صحافت ہو، تم نہ سنو گے تو کون سنے گا۔ سنو! ایک اور ظلم ہوا۔ زنِ بیوہ اندرا گاندھی نے مجھے مسلمان سمجھ کر جائداد متروکہ قرار دیا اور کاغذات پنشن مملکتِ خداداد پاکستان میں حاکمِ پنجاب کو بھیجے۔ فرماں روائی ان دنوں لاہور میں غلام مصطفےٰ کھر کی تھی اور اہلِ دفتر نذرانے میں یقینِ کامل رکھتے تھے۔ میرے پاس جو دولت ہے وہ سخن کی ہے۔ یہ میری شاعری ہے۔ ایلن براؤن کے لیے ایک قصیدہ حسبِ فرمائش منشی شیو نرائن

لکھا تھا۔ اس قصیدے میں روشِ خاص سے اظہارِ اسم نواب مصطفٰی کھر کر دیا۔ تم خود قدر دانِ سخن ہو فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور حفیظ جالندھری تین استاد اس فن کے تمہارے یار ہیں۔ میری محنت کی داد مل جائے گی۔

ملاذِ کشور و لشکر، پناہ شہر پناہ — جنابِ عالی کھر، سرفراز، والا جاہ

بلند رتبہ وہ حاکم، وہ سرفراز امیر — کہ باج تاج سے لیتا ہے، جس کا طرفِ کلاہ

وہ عینِ عدل، کہ دہشت سے جس کی پرسش کی — بنے ہے شعلۂ آتش اُنیس پرّۂ کاہ

وہ مہرباں ہو تو انجم کہیں "الٰہی شکر" — وہ خشمگیں ہو تو گردوں کہے خدا کی پناہ

نہ آفتاب، ولے آفتاب کا ہم چشم — نہ بادشاہ، ولے مرتبہ میں ہمسر شاہ

یہ ترک تازسے برہم کرے گا بزمِ صغیر — بنے گا شوق سے تا غرب اس کا بازی گاہ

ابھی یہ قصیدہ حوالۂ ڈاک نہیں کیا تھا۔ اطلاع ملی کہ حکومت بدل گئی ہے اور نوشیرواں صفت، عادل مزاج نواب صادق حسین قریشی گورنر کے عہدے پر سر پر آرا ہوئے ہیں۔ میں نے سابقہ قصیدے میں سے ہمیں اشعار جس میں نواب مصطفٰی خاں کھر کا نام آتا تھا نکالے اور ان کی جگہ نئے گورنر صاحب بہادر کا نام نامی، اسمِ گرامی پرویا اور پورا قصیدہ بخطِ جلی لکھوا کر بعجلت نذر کیا کہ حکومت پھر نہ بدل جائے۔ رسید ملی نہ جواب۔ خبر آئی کہ غلام مصطفٰی کھر نے گورنری کا پرانا تاج محفوظ خانے سے نکلوا کر دوبارہ زیبِ سر کیا ہے۔ میر مہدی مجروح مُصر کہ نیا قصیدہ لکھو۔

میں نے کہا "صاحب! تم ہر تیسرے ماہ ایک گورنر تبدیل کرو گے۔ میں قصیدہ کہاں تک لکھا کروں گا" بھائی قصیدہ لکھنا کیا آسان بات ہے؟ کلیجہ چبانا پڑتا ہے۔ میں نے سابقہ قصیدے سے بطریقِ احسن کام چلایا اور خوش خط نستعلیق لکھ کر دوبارہ بھیجا۔ خط کی رسید ملی۔ چند الفاظ تشکر کے ہمرشتہ خط تھے۔ خط پڑھا اور رو دیا۔ بہادر شاہ ظفر کہ دلی کی آخری شمع تھا یاد آیا۔ لکھا تھا۔ "بیشک گورنر ہوں۔ پر اقتدار کی عنان حنیف رامے کے ہاتھ میں ہے۔ یہ حامی بچہ، مرقع ساز و فتنہ پرداز میری ایک نہیں چلنے دیتا۔ اُلٹا قائدِ عوام سے شکایتیں کرتا ہے اور مجھ پر تہمتیں تراشتا اور پٹواتا ہے —" اے بھائی غلام مصطفٰی کھر! میں نے دلی کا آخری اُجالا دیکھا ہے۔ تم نے خط کا جواب دیا ہے۔ قصیدے کی تعریف کی۔ میرا دل بڑھایا اور یہ نہ بھانپا کہ غالب خلد قیام نے ایلین براؤن کے قصیدے میں تصرف کیا ہے۔ میں خوش،

میرا خدا خوش!

اب سنا ہے کہ فرماں روائے بہاول پور گورنر پنجاب مقرر ہوئے ہیں۔ اے بھائی! تم بتاؤ کیا کروں۔ قصیدہ نہ لکھنا خلافِ عادت ہے اور یہ غیر مناسب کہ حاکم تبدیل ہو اور غالب نئے فرمانروا کو قصیدہ پیش نہ کرے۔ پر قصیدہ لکھنے کے لیے مجھ میں دم نہیں۔ خدا نے روزہ نماز مجھ پر معاف کر دیا ہے کیا تم اور ولی نعمت، آیۂ رحمت نواب عباس محمد خاں عبّاسی ایک قصیدہ معاف نہ کرو گے؟ مجھے معلوم ہے تم نہیں مانو گے۔ سو میں نے سابقہ قصیدے میں تین اشعار نئے ڈالے۔ تشبیب اور گریز کو بہ تصرف بدلا۔ واللہ! اب یہ تازہ ہو گیا ہے۔ یوں سمجھو جو جھوٹ میں نے کھر کے لیے لکھا تھا وہ نئے اعلیٰ حضرت کے شایانِ شان سچ میں تبدیل ہوا۔ یہ مرقع طلب نامہ تمھیں بھیجتا ہوں۔ امروز اخبار کے سرورق پر اور "تخلیق" میں چھاپنا اور نیچے غیر مطبوعہ لکھنا نہ بھولنا۔ میری طرف سے بصیغہ ڈاک گورنر صاحب بہادر کو بھیجنا!

تم خاطر جمع رکھو۔ بے رزق جینے کا ڈھب مجھے آ گیا ہے۔ رمضان کا مہینہ روزہ کھا کھا کر کاٹا۔ آگے خدا رازق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس صاحب! جب ایک چیز کھانے کو ہوئی، اگرچہ غم ہی ہو، تو پھر کیا غم ہے؟ اور جو تم ایک شذرہ اخبار امروز میں ظہیر بابر سے کہہ کر لکھوا دو، اور اور کچھ ذکر بالفاظ موزوں "محفل محفل" میں کر دو اور اوپر تلے نصف درجن مراسلات بنام مدیرانِ اخبارات بہ تبدیلی نام و عنوان چھپوا دو تو سجدۂ شکر بجا لاؤں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو سرگودہا کی قومی زبان کانفرنس میں قرارداد اس مضمون کی پیش کرنے میں سہولت ہو۔ پنشن کی منظوری ممکن ہو، کسی بہانے یہ غم مٹے۔

بھائی سنو! ادب کی بڑی اصناف دو ہیں۔ ایک نظم دوسری نثر۔ مثنوی، قصیدہ، غزل، شہر آشوب، مخمّس، مسدّس، چوبلیتہ یہ سب اصنافِ نظم شمار ہوتی ہیں اور جو مرتّب اور غیر مرتّب تحریر میر امّن، رجب علی بیگ سرُور، کاظم علی جوان، حیدر بخش حیدری لکھتے ہیں وہ سب نثر ہے۔ ایک طرزِ سخن اس کا میں نے خطوں میں ایجاد کیا۔ ہمارے زمانے میں اور اب تک بحر، وزن آہنگ صنفِ نظم کا جزوِ اوّل شمار ہوتا ہے۔ اساتذۂ ادب نے نثر کو مرقع اور مقفّٰی اور مسجّع بنایا اور خوبصورتی پیدا کی۔ لیکن لُغت اور محاورہ اور اصطلاح میں قیاس پیش نہیں کیا۔ اب سُنا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں سب متروکاتِ سخن شاملِ نصابِ ادب کی گئی

ہیں اور نظم و نثر کے ادغام سے ایک اور صنف "نثری نظم" پیدا کی ہے۔ مجھے بتاؤ یہ کیا شے ہے؟ یعنی شاعری ہے یا غیر شاعری؟ نثر ہے یا غیر نثر؟ میں نے میر مہدی مجروح، مصطفیٰ خاں شیفتہ اور خواجہ حالی سے دریافت کیا۔ کسی نے اس تیسری جنس کا پتہ نہیں دیا۔ اب تم سے بلا تکلف دریافت کرتا ہوں کہ نظم اور نثر دونوں صیغے تانیث کے ہیں۔ ان کا ارتباط فطری کیوں کر ہوا اور اختلاط باہمی و ہم جنسی سے نیا وجود کیسے پیدا ہوا؟ پھر کیا یہ ولد الحیض ہے؟

اور کیا اپنے رسالے میں تم بھی یہ جنس چھاپتے ہو؟ سنا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی نے اپنے رسالوں میں اس خلافِ فطرت صنف کے مخالف آواز اٹھائی ہے اور تم دونوں کے ہم نوا ہو! بہت اچھا کرتے ہو۔ اصناف نظم و نثر مثل ملک و قوم کے ہیں۔ ان کو منتشر کرو گے تو سمجھو ملک اور قوم کا انتشار سامنے آ رہا ہے۔

نویں اکتوبر کو اطلاع ملی کہ ادب میں اوّلیت کی لڑائی کراچی میں بھی چھڑ گئی ہے۔ اب موضوع "نظم آزاد" ہے جس کا موجدِ اصلی پانی پت کا ایک انصاری حالی ہے۔ اسے نہ مانو تو مولوی آزاد و فرخ نہاد کو اس کا بانی سمجھو۔ "افکار" میں غم خوار ازلی و ابدی صہبا لکھنوی نے عزیز گرامی راشد کا خط اس بارے میں چھاپا ہے۔ خط کیا ہے؟ ہجو ملیح، ضیا انصاری، مجتبیٰ حسین اور صہبا لکھنوی سب اس کی لپیٹ میں آئے۔ چشمک اچھی ہوئی۔ افکار کا ذکر چلا، صہبا لکھنوی کا چرچا ہوا۔ جو باتیں ناگفتنی تھیں زبان زد عام ہوئیں۔ اس سے زیادہ اس کا فائدہ نہیں۔ تمھیں معلوم ہے محمد حسین دکنی نے برہان قاطع لکھی۔ میں نے اس کا جواب قاطع بُرہان لکھا۔ ڈھاکہ کے آغا احمد علی نے موید برہان تصنیف کی۔ میرا اعتراض تو خلط مبحث پر تھا۔ میں نے علم و تحقیق سے کام لیا۔ لغات نویسی کے اصول سمجھائے ایک کے بدلے میں دس دلیلیں دیں۔ پر علمی مباحث میں جذبات اور ذاتیات خلط ملط ہو گئے۔ دکنی کی دشمنی میں گالیاں کھائیں۔ غالب بچا نہ اس کے بیوی بچے۔ ایک دلیل کے بدلے سو سو دشنام مطبوع و غیر مطبوع۔ اللہ اللہ خیر صلّٰی۔

مرزا انور علی مدت سے بیمار تھے رات کو بارہ پر دو بجے مر گئے۔ قیدِ حیات سے نجات پا گئے۔ ان کے فرزند نسبتی ڈاکٹر وزیر آغا کی طرف سے ان کی تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ سجاد نقوی اور صوفی فقیر محمد اور انور سدید بعد از تکفین پہنچے۔ خبر ملی کہ ہم مشرب دیرینہ قتیل شفائی ولایت

سے واپس آگیا ہے۔ تم نے خبر اس کی "محفل محفل" میں چھاپی اور اس کی واپسی کو "نازن کی واپسی" کہا اور کشور ناہید کی بلادِ غرب سے واپسی کو "عذرا کی واپسی" کہا۔ تم شگفتہ نگار ہو بیٹھے لفظ سے نمک کا ذائقہ پیدا کرتے ہو۔ پر سب لوگ طنزِ ملیح و لطیف میں فرق نہیں کرتے۔ قتیل شفائی ناراض تو نہیں ہوا؟ پھر عرق انگلیسہ جس کا وعدہ تھا کیوں نہیں پہنچا؟ آزاد کوثری لوہشون کے ترجمے میں تصرفِ بے جا کا شکار کہاں کہاں ہوا ہے؟ سنا ہے کہ امجد اسلام امجد شاعری سے تائب ہو کر اب عربی نظموں کی بامداد محمد کاظم تاریدکر رہا ہے۔ یعنی ترجمہ عربی سے محمد کاظم کرتا ہے اور انہیں کاغذ پر امجد اسلام امجد آتارتا ہے۔ واہ وا!

بھائی! داستان نگاری میں رجب علی بیگ سرور کا معترف ہوں۔ میر امّن کا قدر دان ہوں۔ پاکستان میں غلام عبّاس، غلام الثقلین نقوی، مسعود مفتی اور یونس جاوید کے سوا کسی اور کو افسانہ نگار نہیں مانتا۔ اب انور سجّاد اور رشید امجد کا دور ہے۔ لفظوں کی گود میں کہانی کا چہرہ چھپاتے ہیں۔ کمال فن دکھاتے ہیں۔ ان کی فراست تیز اور میر اعلم محدود۔ صاف کیوں نہ مانوں یہ دونوں میری فہم کی زد میں نہیں آتے۔ تمہارے پرچے میں عالم علی سیّد کی داستان پڑھی۔ جی خوش ہوا۔ سبحان اللہ ایک سیّد نے کہانی کا فن زندہ کیا۔ اور اس ماہ اندرون سرورق ماہ جبینانِ پاک کی صورتیں نظر نہیں آئیں دل افسردہ ہوا۔ مجھ بوڑھے کی نظر کمزور ہے۔ خوبصورت چہرہ کحل البصر ہے۔ چشمِ پرخمار سرمۂ خوش نظر ہے۔ بھائی اس سے محروم نہ کرو۔ للہ باللہ!

لوگ مجھ پر اعتراض کرتے ہیں کہ میں نے خواجہ حالی کو "یادگار" لکھنے پر مامور کیا۔ اس نے مدلل مدّاحی کی۔ غالب کو حیاتِ دوام کی خلعت عطا ہوئی۔ رقعات میرے سرسری تھے۔ منشی شیو نرائن آرام نے اصرار چھاپنے پر کیا۔ میں نے دوست نوازی میں انکار نہ کیا اور اس کا ایک نام پسندیدہ تجویز کیا۔ میری توقع کے مطابق مجھے نئی نثر کا بانی قرار دیا گیا۔ الحمدللہ۔ میں نے خوشی سے یہ اعزاز قبول کیا۔ تم پوچھو ایسا کیوں کیا؟ طلبِ شہرت کے لیے؟ حصولِ عزّت کے لیے؟ حصولِ دوام کے لیے؟ بارہ برس کی عمر سے کاغذ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ ایک سو باسٹھ برس سے اوپر عمر ہوئی اس شیوے کی ورزش میں۔ آپ ملاحظہ فرمائیں۔ کس نے قدردانی کی؟ ہم اور آپ کس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں؟ اور کی فیض رسانی اور قدردانی کو کیا روئیں؟ جہاں

ناہنجار بڑا بے مہر و بے وفا ہے۔ جائز حق نہیں دیتا۔ میں نے غزل کو حیاتِ نو دی۔ نثر کو آراستہ کیا۔ دادِ سخن کس کو ملی؟ محمد ابراہیم ذوق کو؟ لاہور میں حلقہ کس کا قائم ہوا؟ ذوق کا —— پر میں آزردہ نہیں ہوا۔ محمد حسین آزاد نے ذوق کے سر پر تاجِ سخن آرائی رکھ دیا۔ میں ملول نہیں ہوا۔ اب خالد احمد نے حلقۂ اربابِ غالب قائم کیا ہے اور اس میں میری عزیزاز جان امراؤ جان بیگم سے اور نواب زین العابدین عارف سے کہ میرا فرزند دلبند ہے مضامین لکھوائے ہیں اور نبی بخش حقیر۔ بدرالدین فقیر۔ یوسف علی عزیز۔ احمد حسین میکش اور جواہر سنگھ جوہر میری سخن آرائی کا سکہ تسلیم کرتے ہیں تو اعتراض کیوں؟ لوگ غالب کو تسلیم نہیں کرتے! نہ کریں۔ میں تو غالب کو تسلیم کرتا ہوں۔ اس کے آگے کورنش بجالاتا ہوں۔ آئیے آئیے جواد الدولہ۔ دبیر الملک نواب اسداللہ خاں غالب، شاعرِ عظیم۔ شاعرِ کبیر۔ تم یہی کہوگے اپنے منہ میاں مٹھو ابلا سے کہو۔ ہزار بار کہو! اب اور کیا لکھوں؟ کیا جواز پیش کروں؟ میاں اپنے نام کا سکہ جاری کرو اور ایک خاص نمبر اپنے رسالے کا چھاپو "اظہر جاوید نمبر" —— میں اس میں تقریظ تمہارے فن پر لکھوں گا۔ تم پسند کروگے! نام پاؤگے!

منڈیر کے پاس جو تخت بچھا ہے اس پر بیٹھا ہوا دھوپ کھا رہا ہوں۔ اے لو۔ یہ سامنے کون آ رہا ہے؟ تین کتابیں مجلّا و مطلّا ہاتھ میں تھامے اخاہ! ن۔م۔ راشد۔ اجی حضرت آپ کہاں؟ آپ کا ذکر تو ابھی اظہر جاوید سے کر رہا تھا۔ جواں بخت، جواں دولت۔ جواں فکر۔ جواں نظر۔ جواں فرد اور کون کونسا لفظ میری زبان پر تمہاری شان میں آیا تھا۔ ہاں۔ جواں مرد۔ جواں مرگ ہے ہے۔ یہ الفاظ بلا میری زبان پر کیوں آگئے۔ میں نے حالی اور آزاد کو نظمِ آزاد کا بانی کہا۔ تم برا مان گئے؟ کیوں نہ مانو! تمہارا حق میں نے تم سے چھینا۔ برا کیا۔ معذرت صد ہزار معذرت۔ اب ناراض نہ ہو آؤ بیٹھو۔ کیا کہا دنیا سے منہ موڑ آئے۔ قیدِ فرنگ و جسم و جاں سے آزاد ہو آئے۔ اے میاں! یہ ہیئی کب کہا تھا۔ ہائے ہائے!

نگاشتہ و رواں داشتہ ہفتہ ۱۱ اکتوبر سالِ حال۔

نجات کا طالب

غالب

۴

میرزا اظہر کہ پیوستہ بدل جا دارد
ہر کجا ہست خدایا، بسلامت دارش

صاحب!

کئی بار جی چاہا تم کو خط لکھوں مگر متحیّر کہ کیا لکھوں اور کیوں لکھوں۔ اب جو تمھارا خط آیا اور تم نے اس زمانے کو یاد کیا جب طرح طرح کے معاملات مہر و محبت ہم دونوں کے درمیان تھے۔ شعر کہے، دیوان جمع کئے، مشاعرے پڑھے۔ میں نے "قاطع برہان" لکھی اور تم ہر چند ہمنوا میرزا قتیل کے تھے۔ اسے "تخلیق" میں چھاپا۔ سخن گسترانہ بات کا مزا پیدا کیا۔ حریفانِ بذلہ اس پر تم سے ناراض ہوتے، قرولی نکالی، گالی دی۔ تم نے سب کچھ سنا اور ہنس دئے کہ یہ تقاضا اظہار کی آزادی کا تھا، سو ہم نے پورا کیا۔ پھر تم نے کالم کی ابتدا اخبار "امروز" اور "حریت" میں کی۔ وہاں بھی مجھے یاد رکھا۔ میں نے تمھارا ذکر "عودِ ہندی" میں کیا۔ اور تمھارے نام چند رقعے لکھے کہ ادب میں تمھارا نام ہوا اور سب کو پتہ لگے کہ غالبؔ خستہ تمھارا گرویدہ، محبت رسیدہ ہے۔ تمھاری آؤ بھگت بڑھے۔ تم خوش قلم اور زود گو کہلاؤ۔ مشاعروں میں بلائے جاؤ اور طلبگارانِ اشاعت کی دعوتوں میں جاؤ۔ لیکن غالبؔ

کے بغیر کون سے کام بند تھے کہ تم نے بھی مجھ بڈھے کھوسٹ کو بھلا دیا۔ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط، تم نے ہندوستانی ادیبوں کا مسئلہ اٹھایا۔ تمھارے جریدے نے۔ ہائے عالم آشکار جریدے نے بھی یہ روش اختیار کی؟ اب میں خط لکھوں تو کیا لکھوں اور کیوں لکھوں؟ —— تم کہو گے۔ بڈھا غالب دیوانہ ہے۔ ایک سو سات برس کا ہو گیا ہے۔ کیوں کر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں۔ ہاں اتنا ہوش باقی ہے کہ اپنے آپ کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ واہ۔ کیا ہوشمندی ہے کہ قبلۂ اربابِ ہوش کو خط لکھتا ہوں اور اس بات کی سمجھ رکھتا ہوں کہ تین پہر گئے بادشاہ کی غزل بنا کر قلعۂ معلّٰی میں حاضری دیتا ہے۔ محمد ابراہیم ذوق کو پہچانتا ہوں۔ خاقانیٔ ہند، استادِ شاہ مانتا ہوں اور الطاف حسین حالی سے یادگار لکھنے کا تقاضا بالاصرار کرتا ہوں۔ عدالتِ خفیہ کے جج صاحب رنگین بہادر اور ٹامس مٹکاف ایجنٹ و کمشنر دہلی اور سانڈرس صاحب بہادر کمشنر کو اپنا غمخوار اور محسنِ دیرینہ سمجھتا ہوں۔ تم کہو گے میں نے تقاضائے وقت کو پہچانا؟ میاں درست، صد بار درست! لیکن میری بھی تو سنو!

میں نے انگریز بہادر کی نوکری پر تین حرف بھیجے۔ اپنی جگہ امام بخش صہبائی کو دے دی۔ لعنت ایسی نوکری پر جس میں عزت نہ ہو۔ پیوستہ بدل میرزا اظہر جاوید! غالب کا طرّہ دستار ہے۔ "سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپاہ گری"۔ انگریزی سرکار میں علاقہ ریاست دو دمانی کا رکھتا ہوں۔ معاش اگرچہ قلیل ہے۔ مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن والے جب تک خود نہ بلائیں نہیں جاتا۔ اخبار، رسالہ اور پرچہ کے مدیران سب میرے دوست۔ حبیب۔ رفیق۔ مربّی، قدردان مگر بن مانگے اپنا کلام نہیں بھیجتا۔ تمھارا معاملہ اور ہے۔ میں نے مہینوں بعد سات شعر کی غزل کہی۔ اور تمھیں بن مانگے ارسال کی۔ اب تم پڑھنے والوں سے پوچھ رہے ہو کہ "غالب کی غزل چھاپوں یا واپس کر دوں؟" غالب ہندوستانی شاعر ہے۔ ہیہات، ہیہات! غالب نے وطن چھوڑا! کیوں؟ اردو کے لیے فارسی کو چھوڑا۔ کیوں؟ اردو کے لیے۔ غزل کہی، قصیدہ کہا، خطوط لکھے، دیوان جمع کئے، صرف اردو کے لیے۔ ایک زنِ بیوہ نے بھارت سے اردو کا دیس نکالا دیا۔ غالبِ خستہ جان روتا رہا۔ اردو نے پاکستان میں نیا گھر بنایا، غالب خستہ کی جان میں جان آئی۔ میں خوش ہوا۔ میرزا تفتہ، میر مہدی مجروح، الطاف حسین حالی اور مصطفیٰ خاں شیفتہ، غرض

ایک ایک کو یہ خبر سعادت اثر سنائی۔ اب تم کہتے ہو کہ اردو کے نئے دیس میں غالب کا داخلہ ممنوع! کیوں! اے بھائی کیوں؟

کچھ خوفِ خدا کرو۔ عقل تمہاری رسا ہے۔ ان کو نہ دیکھو۔ جو ہر لغت کو تینوں حرکتوں سے لکھتے ہیں اور اپنے پرچے میں وطن دوستی کا چھوٹا طومار باندھتے ہیں۔ ہندوستانی ادیبوں کے ساتھ دوستیاں بناتے ہیں۔ ان کے ساتھ تصویریں کھنچواتے ہیں۔ ایک دوسرے کی شان میں قصیدے پڑھتے ہیں۔ شامیں مناتے ہیں اور مر جائیں تو سابقہ دوستیاں یاد کر کر روتے ہیں۔ تم احمد ندیم قاسمی کی تقلید کرو۔ کتنا اچھا بیان موصوف کا شبنم رومانی نے اخبار "مشرق" میں چھاپا ہے۔

اور نجی رشتوں سے زیادہ ادب کے رشتوں کو استوار کرنے پر زور دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ "ادیبوں کو سیاست میں نہیں الجھنا چاہئے اور حکومت کا آلۂ کار بننے کی بجائے امن و آشتی کی پالیسی اختیار کرنے کے لیے حکومت پر اخلاقی دباؤ ڈالنا چاہئے۔" واللہ باللہ یہ میری روش ہے۔ میں نے بہادر شاہ ظفر کی چاکری کی۔ میں نے انگریز بہادر کا قصیدہ کہا۔ ہر دربار میں عزت حاصل کی۔ پھر تم یہ روش کیوں نہ اختیار کرو۔ تم سے پوچھتا ہوں۔ عصمت چغتائی، جگن ناتھ آزاد، خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری اور آل احمد سرور کیا ہندوستانی نہیں۔ کیا ان پر پاکستان میں داخلہ بند ہے۔ ان کی کتابیں وہاں کوئی نہیں چھاپتا۔ جمیل الدین سے اور پروفیسر صدیق جاوید سے اور زہرا معین سے دریافت کرو اور مجھے بتاؤ؟

بھائی! میں نہ کافر نہ مسلمان۔ میرا مذہب ترکِ رسوم ہے۔ زنار نہیں باندھتا، نماز پنجگانہ ادا نہیں کرتا۔ لیکور پیتا ہوں اور خدا کا سجدہ بجا لاتا ہوں۔ دیو داسیوں کو پسند کرتا ہوں اور ان کا سجدہ گزار ہوں۔ یہی میرا ادب ہے، اور جو یہ تمہارے مذہب میں حرام تو میرے داخلے پر پابندی عائد کرو۔ نامہ اور پیام اور خط نہ لکھو، میں خوش، میرا خدا خوش۔ حرفِ شکایت زبان پر آئے تو کافر کہو، اللہ باللہ یہ نہ کرو کہ خورشید راٹھور اور ناہید جمال اور پروین عاطف اور کشور ناہید اور زیتون بانو اور رُتم لیلیٰ اور بسمل صابری کے سامنے مجھے رسوا کرو۔ رالف رسل میرا دلدادہ ہے۔ پڑھتا ہے اور ہنستا ہے پوچھتا ہے: "غالب تم مسلمان کب ہوا؟"

سکندر بوسائی کہتا ہے: "میرزا، اظہر جاوید، تمہارا حبیب لبیب کہاں کا مسلمان ہے؟ کیا یہ نازنینانِ ہزار شیوہ کو سجدہ نہیں کرتا، اور اپنے رسالہ میں ناہید خصالوں اور شیریں جمالوں کی مورتیں نہیں چھاپتا۔ یہ عینِ کافری نہیں؟"

صاحب بندہ! سچ کہتا ہوں اور جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔ میں بھارت کی سرزمین پر پہلا پاکستانی ہوں۔ اس وقت جب میں نے پاکستان کو قبول کیا۔ سید احمد خاں کا مجموعۂ خیال فرد فرد تھا وہ تاریخ اکبری کی تصیح کرتا ــــ آثار الصنادید لکھتا۔ میں کہتا "حضرت! آگے دیکھو، زمانہ بدل رہا ہے۔ پرانے آثار مٹ رہے ہیں، نئے آثار ہویدا ہیں: "اُٹھئے کہ اب وہ لذتِ خوابِ سحر گئی" اس نے میری بات پر کان دھرا۔ روشِ قدیم ترک کی لیکن کب ؟ جب بساط اُلٹ گئی۔ حکومت چھن گئی۔ مسلمان راندۂ درگاہ ہو گئے۔ اور اب کیا باقی ہے؟ ایک داغ فراقِ صحبتِ شب! اللہ بس باقی ہوس! ـــــــــــ یہ بات تم تک پہنچی ہو گی کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لاہور میں "اقبال اردو کانفرنس" کی۔ صدارت ایک جلسے کی میر تقی میر کو اور دوسری مجھے سونپی۔ میں نے شکوہ کیا۔ سید صاحب قبلہ آپ کا مدّاح ہوں آپ کے علم و ادب کا قدردان ہوں پر آپ نے میر تقی میر سے رشتۂ التفات پہلے جوڑا اور غالب غریب کو وزنِ بیت کے طور پر قبول کیا۔ میں نہیں کہتا کہ "نقدِ میر" کی طرح "نقدِ غالب" بھی لکھو۔ پر مجھے اپنی محبّت کا حصّہ میرے حق کے برابر ضرور دو۔ مجھے لاہور بلایا ہے قبول۔ صد بار قبول کہ آپ کے درِ تنقید کا فقیر تکیہ دار ہوں لیکن سنو! مرارجی ڈیسائی آڑے آیا۔ غالب کو مسلمان جانا پروانہ راہداری منسوخ کر دیا۔ میں ہاتھ ملتا دل مسوستا رہ گیا۔ سید صاحب کیا کہتے ہوں گے۔ غالب آخری وقت پر طرح دے گیا۔ اور یہ لطائف حیل ٹال گیا۔ اے بھائی! یہ بات نہیں۔ تم سید صاحب سے ملو تو کہو۔ غالب پا در رکاب تھا۔ اور اب نادم و شرمسار ہے۔ امورِ سرکار کی پابندی پیرانہ سال غالب کے آڑے آئی۔ میں نے اخبار میں اور ریڈیو پر روداد اس کانفرنس کی سُنی۔ صہبا لکھنوی نے کراچی سے رسالہ "افکار" بھیجا۔ اس میں ریاض صدیقی نے روداد اس جلسے کی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لکھی۔ جی خوش ہوا! سبحان اللہ۔ سید صاحب نے ستر برس کی

جوانی میں اُردو کو تازہ خون دیا۔ اُردو کو زندہ کیا۔ اقبال کو زندہ کیا۔ اقبال میرا فرزند معنوی ہے۔ گویا مجھے زندہ کیا۔ واہ وا !

اب آگے سنو! جب ضبطی پاسپورٹ کی اطلاع مولوی محمد باقر نے دہلی اخبار میں چھاپی تو مرار جی ڈیسائی نے کہا: "میرزا شور نہ کرو! تمھارا اس میں فائدہ ہے۔ تم سرکاری مہمان بن کر پاکستان جاؤ اور عزت پاؤ۔ سید عبداللہ کی کانفرنس میں تمھیں کون پوچھے گا۔" میں بربنائے مصلحت و فائدہ مان گیا۔ ڈاکٹر خیرات ابن رسا کو لکھا: "بر شرطِ حیات اوائلِ دسمبر میں لاہور کو آؤں گا۔ نمائش گاہ لاہور کی سیر کہاں اور میں کہاں۔ خود اس نمائش گاہ کی سیر سے جسے دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا ہے، اب عالمِ بے رنگی کا مشتاق ہوں۔ غالب بوڑھا کھوسٹ، ایک سو سات سال کی عمر، سفر ناقابلِ برداشت پر اقبال کی محبت اور اہلِ پاکستان میں سے سید عبداللہ، عبادت بریلوی، وزیر آغا، محمد حیات سیال، وحید قریشی، شمس الدین صدیقی، جمیل جالبی، اظہر جاوید، غلام حسین ذوالفقار، معین الرحمٰن اور ڈاکٹر طاہر فاروقی کی محبت مجھے کھینچ لے گئی۔

اے بھائی اظہر! لاہور میں جو قیامت مجھ پر گزری تمھیں کچھ اس کا علم ہے؟ — بھائی! اقبال کانگرس میں مجھے کسی نے نہیں پہچانا۔ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے دروازے پر غالب ایک ایک کا منہ تکتا رہا اور روتا رہا۔ ان میں نہ ڈاکٹر سید عبداللہ نظر آئے۔ نہ خواجہ زکریا، نہ غلام حسین ذوالفقار، نہ افتخار احمد صدیقی، نہ مشرف انصاری، نہ غلام الثقلین نقوی، نہ تبسم کاشمیری، نہ ڈاکٹر عبیداللہ کوئی بھی تو نہیں تھا۔ یہ کیسی اقبال کانگرس تھی۔ ایک بری جمال کو اپنا نام بتایا کہ اجازت داخلے کی ملے۔ پوچھنے لگی "باپ کا نام کیا ہے؟" میرا دل جل گیا۔ منہ چھپا کر بے نیلِ مرام واپس آ گیا۔ اسرار زیدی، اور عبدالسلام خورشید اور عطاء الحق قاسمی نے میری غم خواری کی اور لکھا کہ اس کانگرس سے اہلِ علم و ادب کو الگ رکھا گیا ہے اور ڈاکٹر خیرات ابن رسا سائنس کے آدمی ہیں۔ انھیں کیا پتہ کہ غالب کون ہے؟ تم انصاف کرو! ڈاکٹر سید عبداللہ کی کانفرنس میں میرا یہ حال ہوتا؟

یہ بات برسبیل تذکرہ آگئی۔ وزیر آغا نے اب لاہور کو اپنا مسکن بنا لیا ہے۔ تم سے ملاقات ہو تو انھیں بتانا۔ سر آغاز فصل میں ثمر ہائے ہیش رس کا پہنچنا نوید ہزار گونہ میمنت و شادمانی ہے۔ اور جو ثمر وہ بھیجتے ہیں وہ ثمر رب النوع اثمار ہے۔ تعریف اس کی کیا کروں، کلام اس باب میں یہ چاہتا ہوں کہ میں ان کو یاد رہوں اور اہلا کا ان کو خیال رہے۔ سال گذشتہ سے پیوستہ میں انھوں نے مشکور حسین یاد کو یاد نہیں رکھا تھا۔ سو وہ اب تک کوستا ہے۔ اور مجھے طعنہ دیتا ہے کہ وزیر آغا کا دم بھرتے ہو۔ رزق گدا میں کمی سے ڈرتے ہو۔ سنا ہے لاہور میں اقبال کے ساتھ انشائیہ کا موضوع بھی جاری ہے۔ اور اب خالد احمد پیچھے ہٹ گیا ہے اور مشکور حسین یاد آگے آ گیا ہے اور اپنی مدح خود کرتا ہے۔ اور دوسرے سب لوگوں کو گالیاں دیتا ہے۔ اے میاں انور سدید کو سمجھاؤ۔ غالب کی حق تلفی قبول کرے۔ میرے خطوط کو اوّلین انشائیہ نہ کہے اور مشکور حسین یاد کو انشائیہ نگار مانے۔ میں نے ایک مرتبہ سمجھایا تھا "جھگڑا ختم کرو"۔ وہ بولا: "میرزا! میں آپ کی بات ٹال نہیں سکتا۔ میرا انشائیہ میں ناشائستگی، اور دشنام اور مذاقِ دنداں نما کو کیونکر شامل کروں؟" اب تم کوشش کر دیکھو اور اسے بتاؤ کلکتے والے کھتری قتیل کی لڑائی میں غالب نے کیا پایا۔ اور اب انور سدید اس بحث سے کیا حاصل کرے گا۔

مکتوب میرا طویل ہو گیا ہے۔ اب نثر اور نظم اور غزل موقوف ہے۔ بس خط لکھتا ہوں اور تمھیں یاد کرتا ہوں اور ہاں "تخلیق" مدتِ بسیار سے نظر سے نہیں گزرا۔ کیا ایسا تو نہیں کہ چھاپتے ہو اور مجھے نہیں بھیجتے۔ اور صرف عشوہ طرازوں میں تقسیم کرتے ہو۔ مجتہد العصر خالد احمد کو دعا۔ امین الخزائن زمان کنجاہی کو دعا۔ یوسفِ ثانی مستنصر حسین تارڑ کو دعا۔ داستان گوئے پاک و ہند انتظار حسین کو دعا۔ سنا ہے کہ سید غلام الثقلین نقوی نے اب افسانہ سے منہ موڑ کر سفر نامہ سے رشتہ جوڑا ہے — ہائے ہائے۔ افسانے سے جنم جنم کی دوستی کیا ہوئی؟ اور ہاں پروین عاطف نے "تخلیق" میں داستان عمدہ رقم کی ہے۔ جی خوش ہوا۔ بھلا ان کو ہماری دعا کہنا اور جو کچھ وہ کہیں وہ مجھے لکھنا۔

مرقوم صبح جمعہ ۲۰ محرم الحرام۔ ۳۱ دسمبر سال حال — عافیت کا طالب

غالب

۵

مہاراج!

مہربانی نامہ پہنچا۔ گرمی، مہنگائی اور ملازمتِ سرکار سے دل میرا ملول تھا۔ تمہارا غصہ میرے سر آنکھوں پر، واللہ یہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔ البتہ یہ خیال تو دل میں آیا کہ دیکھو بھائی کو میرے رقعات سے اُنس نہیں ہے۔ ورنہ ایسی چیز کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ وزیر آغا کے "اوراق" سے میری اُنسیت بجا۔ ندوہ پنجاب کے لیے تحقیق تحریکوں کی اپنی جگہ۔ میں نے لکھا: "بیگم میں میرا دھیان لگا ہوا ہے۔" تم نے سچ جانا۔ کثرتِ اشغالِ سرکاری کو دستاویزِ عذر بنایا۔ تم کچھ نہ بولے۔ اے میاں! تم کیسے مدیر ہو اور اب تک خاموش کیوں ہو۔ غالب نے رقعات کا سلسلہ منقطع کیا...... تو حضرت رجوع بعدالتِ فوجداری کرتے اور مجھ سے دریافت کرتے کیا میرزا اظہر جاوید تمہارا حبیبِ لبیب نہیں ہے اور کیا "تخلیق" تمہارا فرزندِ دلبند نہیں ہے؟ پھر کسی اور کام کو فوقیت کیوں؟

صاحب بندہ! میری سنو!

مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔ ایک خط بھیج چکا ہوں، اب

اس وقت ایک اور لکھتا ہوں۔ تم نے اپنے یارِ دلبند کے دیوان کا دیباچہ لکھنے کی فرمائش کی، میں نے پوری کی۔ تعویق جواب اگر تھی تو بلا وجہ نہیں تھی۔ سو اپنا قصور مانتا ہوں۔ اور خواستگار معافی کا ہوتا ہوں، یہ نہیں پوچھتا کہ تم نے ربط ضبط وزیر آغا سے کیوں بڑھایا۔ اور دوسرے پلڑے کا وزن کم کیوں کیا۔ مجھ کو کہ نالائق، ذلیل ترین خلائق ہوں، اپنا دعا گو سمجھتے رہو۔ کیا کروں، اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ مصطفیٰ خاں شیفتہ اور علاؤالدین علائی کو اپنا دوست مانتا ہوں۔ محمد ابراہیم ذوق کی تعریف جھوٹی مجھ سے نہیں ہوتی اور روشش ترقی پسند لکھنے والوں کی مجھے نہیں آتی کہ رمز، تلمیح، استعارہ اور علامت کو نظر انداز کریں، ایوب خاں صدر رہو تو اس کی جے اور جو یحییٰ خاں سر بر آرائے سلطنت ہو تو اس کی واہ وا۔ کل تک ڈونگرے ذوالفقار علی بھٹو اور زنِ بیوہ اندرا گاندھی پر برسائے۔ اب مرارجی ڈیسائی کی جے اور جنرل ضیاء الحق کی جے میں مصروف تم کھو گئے۔ میں نے بادشاہ ظفر کی تعریف نہیں کی؟ انگریز بہادر کی مدح نہیں کی؟ لیکن تم میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم تر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کی تقریظ کو دیکھو کہ ان کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کے دیباچہ کو ملاحظہ کرو۔ وہ جو فلیپ "دیوانِ حافظ" کی بموجب فرمائش جان جاکوب بہادر کی لکھی ہے۔ اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام .... اور ان کی مدح آئی ہے۔ اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی مطالب ہیں۔ او میاں میرزا زادہ "آزادہ" لاہور کے عاشقِ دلدادہ، میکلیگن روڈ کے رہنے والے حسد سے انار کلی بازار کو بُرا کہنے والے۔ مجھ کج مج بیاں کو سطح سے نہ پڑھو۔ درونِ سطح مطالعہ کرو اور اسے مدحِ افسر نہ کہو، علامت کی زبان میں بات کرنا میری روشِ خاص ہے۔ تم ابراہیم ذوق خاقانی ہند کے مدّاح ہو۔ تھوڑے لکھے پر قناعت نہیں کرتے۔ واللہ باللہ اگر کسی امیر زادے یا شاہزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی اتنی مدح نہ کرتا کہ جتنی میرزا معظم بیگ ترکمان کی اور جتنی تمہارے یار دلبند کی مدح کی ہے۔ اگر وہ ہم کو یا ہماری روش کو پہچانتے تو اس کی اتنی مدح کو بہت جانتے اور مختصر پیش لفظ

پر کہ معنوی لحاظ سے وسعت رکھتا ہے قناعت کرتے۔ قصّہ مختصر تمہاری خاطر مزید کی اور ایک فقرہ ذو معنی جس سے ذم کا پہلو نکلتا تھا نکال کر اس کے عوض ایک ورق اور لکھ دیا۔ اور تمہارے یار دلبند کے نتائج طبع کو کہ میرے معنوی پوتے بھی ہیں مثیلِ غالب و اقبال قرار دیا۔ اس سے زیادہ کی توقع نہ رکھیو اور جو افسر سرکار ہوتے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے حاکم با اختیار ہوتے اور کچھ نہیں تو کسی روزانہ اخبار میں کالم نگار اور روشن آرا بیگم کے رفیق و ضعدار ہوتے، میری غزلوں کا شہرہ ریڈیو اور اخبار میں کرتے تو میں اس سے بھی زیادہ لکھتا۔ اور تقریظ اپنی ان کے دیوان کی تقریب رونمائی میں پڑھتا۔ تعریفِ فراواں کی داد پاتا۔ میرزا معظم بیگ ترکمان ناراض ہو جاتا تو پروا نہ کرتا۔ ظاہرا تمہارے یار دلبند خود فکر نہیں کرلے اور بدخواہ حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہیں۔ وہ حضرات تو بلیشتر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے۔ کس واسطے کہ ان کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ جو لوگ کھتری قتیل کو اچھا لکھنے والوں میں جانیں گے وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے؟

منگل کے روز تین گھڑی دن رہے۔ ڈاک کا ہرکارہ آیا اور سب ساکنانِ جنت کے لیے مجلہ تخلیق لایا۔ میں نے بے تابی سے کھولا۔ گلرنگ سرورق پر سُرخ روشنائی میں نام اظہر جاوید کا دیکھا، سجدۂ شکر بجالایا کہ حسینوں مہ جبینوں کے جھرمٹ میں زندہ ہو۔ لیکن تم نے یہ کیا لکھا ہے کہ وہ جو تخلیق چھاپنے کے لیے ایک شوق اور ولولہ ہوا کرتا تھا اب بجھ گیا ہے۔ واللہ باللہ مجھے پڑھ کر تشویش ہوئی۔ نامِ خدا تم جوان رعنا ہو، مہ جبینوں کی آنکھ کی ضیاء ہو اور پرچہ نہیں چھاپو گے تو زہرہ جمالوں کی محفل کہاں سجاؤ گے۔ اور تخلیق نہیں ہوگا تو ہماری تم سے رسم و راہ کیسی۔ اور پھر تمہارے دیوان پر دیباچہ کیوں لکھوں اور تمہیں اپنا فرزندِ دلبند کیوں کہوں۔ تم نے سنا ایک مردِ ناہنجار نے اخبار "امروز" پر شب خون مارا اور برخوردار سعادت اطوار خالد احمد کا کالم "لمحہ لمحہ" بند کرادیا۔ ہائے ہائے خالد احمد حبیب لبیب حضرت احمق پھپھوندوی کا فرزندِ اصلی ہے۔ پھبتی، ضلع جگت،

طعنہ اور طنز میں یدِ طولیٰ رکھتا ہے۔ مزید تربیت اس کی صاحب" جلال و جمال" حضرت احمد ندیم قاسمی نے دفتر "فنون" میں کی ہے۔ گویا کریلے کو نیم چڑھا کیا ہے۔ اس پر مستزاد ٹی ہاؤس کی مستقل بیٹھک۔ طنز و مزاح اس کے خون میں شامل ہے۔ اس کا شہر لاہور کا رنگ اکتسابی ہے۔ دشنامِ قبیح سے لذتِ ملیح پیدا کرتا ہے۔ اور اس پر قہقہہ فلک شگاف لگاتا ہے۔ گلزار وفا چودھری اس پر خندہ کرتا ہے۔ پر میں مانتا ہوں کہ خالد احمد میرا مدّاح ہے۔ اور حلقۂ اربابِ غالب جو اس نے قائم کیا ہے اور جلسہ ہفتہ وار کرتا ہے۔ میرا نام لیوا ہے۔ اے بھائی "لمحہ لمحہ" کا بند ہو جانا اور امروز اخبار کے خُلد سے خالد احمد کا نکلنا حادثہ ہے۔ لیکن تم نے دیکھا اِدھر کالم بند ہوا اُدھر خالد احمد مطلعِ ادب سے غائب۔ اب نجیب احمد کا تذکرہ ہے نہ معین نجمی کا، نہ یوسف حسن کا، نہ روحی کنجاہی کا، نہ مبارک احمد کا، نہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری کا۔ احمد ندیم قاسمی کی مدح وزیر آغا کی قدح، انتظار حسین سے چوبخ و ونچ انور سدید سے نوک جھونک۔ نثری نظم کی فکر، انشائیہ کا ذکر.... یہ سب گویا "اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے"۔

ایک تصویر راغب شکیب کے مجلّہ "اُردو زبان" میں طبع شدہ دیکھی۔ گلے میں الٹی ٹائی لگا رکھی ہے منہ فلکِ کج رفتار کی طرف اٹھا رکھا ہے۔ دو پاؤں زمین پر دراز، دو ہوا میں معلق۔ نظر میری کمزور ہے پر میں نے پہچان لیا کہ یہ میرے کاشانۂ دل کا ماہِ دو ہفتہ میرزا خالد احمد ہے۔ تصویر کو چوما، آنکھوں سے لگایا۔ ہائے "امروز" سے نکلنے کے بعد کیا صورت بنائی۔ مجھے لکھو کیا یہ معاملہ عزت و آبرو سے ہوا؟ اور کوئی بات موردِ رسوائی تو نہیں۔ تم باہمہ کمالات خفقانی بھی ہو۔ لیکن گوشِ نصیحت نیوش رکھتے ہو؟ زنہار تخلیق بند نہ کرنا۔ یہ وسیلۂ دولت اور ذریعۂ منفعت ہرگز نہیں۔ لیکن صاحبانِ کمال میں عزت، طلبگارانِ اشاعت میں مقبولیت، حکامِ وقت سے معاونِ رابطہ اور حسینانِ پاک سے تعارف کا وسیلہ ہے۔ سب صاحبانِ جریدہ اس حقیقت سے واقف ہیں اور حسبِ موقعہ

وضرورت فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ تم اس سے کیوں محروم رہو۔

تم کراچی بندر سے لوٹے اور ہر چند سفر نامہ لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتے پر مجھے بتاؤ کہ کیا تم وہاں ہاتھوں ہاتھ نہیں لیے گئے۔ ارادہ تمہارا صرف سات یوم رہنے کا تھا لیکن تم ایک روز اوپر دو ہفتے رکے رہے۔ یہاں شور اٹھا کہ میرزا اظہر جاوید ضیافتوں میں اور حسینوں کی صحبتوں میں اور ادبی محفلوں میں اور اپنی شاموں میں شریک ہے۔ شفیع عقیل، نسیم درانی، محسن بھوپالی تمہارے یارانِ پارینہ سہی پران صاحبانِ کمال نے کبھی بوڑھے کھوسٹ صاحبِ دیوان میرزا اسداللہ خاں غالب کو بھی جھوٹے منہ بلایا ہے؟ اور راجکماری قلدیپ کور، اور شیریں غزالہ اور راحت گل اور سائرہ ہاشمی اور ثمینہ راجہ اور زرینہ ذوالفقار اور حمیدہ معین رضوی اور نگینہ گل اور نغمانہ عمر اور ہجویری بھٹی اور پروین عاطف اور شیریں لغاری کا صرف تمہارے ساتھ التفاتِ خسروانہ کیوں؟ اے بھائی یہ سب "تخلیق" کے ثمراتِ شیریں ہیں۔ شیخ عبدالقادر مخزن شائع نہ کرتے، ابوالکلام آزاد الہلال نہ نکالتے، نیاز فتح پوری نگار نہ چھاپتے، دور کیوں جاتے ہو تمہارے زمانہ میں احمد ندیم قاسمی فنون کے اور راغب شکیب اُردو زبان کے مدیر نہ ہوتے تو کیا اتنی جلدی مقبول ہو جاتے؟ لوگ ان کے سامنے کھڑے ہو کر تعریفیں کرتے؟ یہ سوال میں تم سے کرتا ہوں۔ آج مجھ کو بڑی تشویش ہے اور یہ خط میں تم کو کمال سراسیمگی میں لکھتا ہوں۔ جس دن میرا خط پہنچے اگر وقت ڈاک کا ہو تو اسی وقت جواب لکھ کر روانہ کرو۔ اور اگر وقت نہ رہا تو ناچار دوسرے دن جواب دو۔ منشا تشویش و اضطراب کا یہ ہے کہ "تخلیق" جاری رہے اور میرے رقعات کہ تم ان کے مشتاق ہو اور مکتوب لکھ کر پیہم اصرار سے منگواتے ہو مسلسل چھاپتے رہو۔ اور تخلیق کے ثمراتِ دور رس سے کہ شمار ان کا نہیں ہے فیضیاب ہوتے رہو۔

میری جان! تم متعجب ہو گے لیکن یہ سچ ہے کہ خاقانیِ ہند محمد ابراہیم ذوق نے دربارِ ظفر سے روگردانی اختیار کی اور درخواست برائے ڈیکلریشن اخبار انگریزی سرکار میں گزار دی۔ میں ستم رسیدہ عمر گزیدہ ہوں۔ لیکن جو تم حورانِ پاک سے مضامین، غزلیں، نظمیں اور انشائیے بلامعاوضہ لکھوا کر مجھے روانہ کرو تو ایک پرچہ جنت الفردوس سے میں بھی جاری کروں۔ اپنی غزلوں

اور قصیدوں پر نثرتے لکھنے والوں سے داد حاصل کروں۔

پیرزادہ عطاء الحق قاسمی استاد ایم اے او کالج قسمت لاہور و مدیر ادبی ایڈیشن روزنامہ نوائے وقت فرستادگانِ سرکار کے ساتھ بسلسلہ عرس حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ دلّی آیا۔ میرے غریب خانہ پر بھی قدوم میمنت لزوم فرمایا اور میرے یارانِ دلنواز ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، محمد حیات خاں سیال، سید معین الرحمٰن اور وزیر آغا اور سجاد نقوی کے مہربانی نامے کہ بصیغہ ڈاک نہیں آسکتے تھے مجھے پہنچائے۔ کیا کہوں اس کے دیکھنے سے دل کیا خوش ہوا۔ دو دن اپنے غریب خانے پر مہمان ٹھہرایا۔ الطاف حسین حاؔلی، ہرگوپال تفتہؔ، مصطفٰی خاں شیفتہؔ، مولوی علاؤالدین علائی سے صحبت و موانست اس کی پیدا کی۔ ایک مشاعرہ اس کے اعزاز میں قلعہ معلّی میں منعقد کیا۔ صدارت جس کی بہادر شاہ ظفر نے کی۔ اس نے میری غزلوں کی داد دی۔ میں نے کالم "روزنِ دیوار سے" کی تعریف کی۔ اسے ادیب طنّاز ہم پلّہ۔ تربھون ناتھ ہجؔر اور احمد علی شوق کسنڈوی اور میرزا چھوبیگ ستم ظریف تسلیم کیا۔ ایک طرزِ نگارش مزاح کی خاص میری دولت ہے۔ اس پر اوّلیت کا حق فائق رکھتا ہوں اور اس میں کسی کو شامل نہیں کرتا۔ یقیں بریقیں یہ بات اس کو ناگوار نہیں ہوتی۔ لیکن سفرنامہ ہندوستان بعنوان "مسافتیں" کشور ناہید کے رسالہ "ماہِ نو" میں اوّلاً اور ثانیاً الطاف حسین قریشی کے مجلّہ اُردو ڈائجسٹ میں چھاپا۔ دونوں مرتبہ تذکرہ اس میں میرا نہیں کیا۔ مجھے دکھ ہوا۔ کیا وہ مجھ کج مج بیان سے ناراض ہوگیا ہے یا خاطر مدارت میں کمی واقع ہوئی۔ واللہ "یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں"۔

سنا ہے کہ گلزار وفا چودھری نے میرا خاکہ کھینچا۔ مجھ پر گندگی پھینکی، رسوا کیا، یہ شخص کون ہے کہ مجھ سے کج ادائیاں کرتا ہے۔ راوی معتبر سے معلوم ہوا کہ اس نے تمھارا اور مستنصر حسین تارڑ کا اور انجم رومانی کا نام لے کر بھی پھپھولے پھوڑے ہیں۔ پھر میں کس شمار میں ہوں اور گلہ گزار کیوں ہوں؟ سنا ہے سراج منیر نے تنقید سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اب تقریظ کا سودا سر میں سمایا ہے۔ اور "روزنِ دیوار سے" چھپ گئی ہے۔ اور رونمائی اس کی نیشنل سنٹر لاہور میں ہوئی۔ ایک جلسہ راولپنڈی میں اور ایک پشاور میں ہوا۔ دیرینہ دمسازوں اور پارینہ غم گساروں اور طلبگارانِ شہرت نے دلداری کی۔ مضامین لکھے۔ شہرت اس کتاب کی دور دور پہنچی۔ یہ

خبر مجھ تک ابن انشا، نے پہنچائی کہ سراج منیر نے توبہ توڑ کر تنقید پڑھی۔ گلزار وفا چودھری
کتاب کے ہم رکاب پشاور گیا۔ پر میں اس سے اب تک محروم ہوں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی
شاگرد مولانا مملوک علی بھی اس کتاب کے مشتاق و طلبگار ہیں جو ہو سکے تو دو جلدیں بصیغۂ
رجسٹری ڈاک جلدی روانہ کرو۔ اور بین المملکتی خرچ ڈاک کی گرانی کی پروا نہ کرو۔ لیکن یہ
بات عطاء الحق قاسمی کو معلوم نہ ہو۔ میں اس پر تبصرہ رتن ناتھ سرشار سے "اودھ پنچ" میں
اور مولوی محمد باقر سے "اخبار ظفر" میں کراؤں گا کہ "عطائیہ" اور "انشائیہ" میں حد امتیاز
قائم ہو۔ اور جو یہ مضامین تقریب اخبار" نوائے وقت" میں شائع ہوں تو مجھے بھیجو۔ راوی
اس بیان کا ریاض مجید ہے۔ پر اس کی تصدیق انور محمود خالد نے اور تائید احسن زیدی نے کی
ہے کہ مبارک احمد میرے خطوں کو نثری نظمیں کہتا ہے۔ اے بھائی! اسے کہو یہ ظلم نہ کرے۔
یہ کرامت، یہ اعجاز مبارک احمد کا ہے کہ جو نثر ہے اس کو نظم کہتا ہے اور جو نظم ہے اس کو سرے
سے نیست و نابود کر دیا ہے۔ اس کی عبارت آرائیاں اور خود نمائیاں اس کو مبارک۔ غالب اس
جھگڑے میں نہیں پڑتا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وزیر آغا اس جنس کو اپنے جریدے اوراق
میں چھاپتے ہیں مگر بے عنوان اور تم نے یہ رعایت صرف کشور ناہید کو دے رکھی ہے اور
تم اسے بلا اعلان حصۂ نظم میں شامل کرتے ہو۔ اے بھائی! میں پھر بلا خوفِ تردید اور
بلا جبر و اکراہ کہتا ہوں اصنافِ نظم و نثر مثل قوم و ملک کے ہیں اور جوان کو منتشر کردے گے
تو سمجھو کہ ملک و قوم کا انتشار سامنے آرہا ہے۔ غور کر کے بتاؤ ان دنوں پاکستان اور
ہندوستان میں حالات سیاسی و معاشرتی کیا ہیں جو وہاں نثری نظم پروان چڑھ
رہی ہے؟ فقط از اسد اللہ الغالب

رقم زدہ ۹ جون ۱۹۷۸ء

٦

میری جانِ اظہر جاوید!

ناسازیِ طبیعت و بے ربطیِ اطوار، بطریقِ داغ بالائے داغ، آرزوئے دیدار دو آتشہ شرارہ بار اور ایک دریائے ناپیدا کنار ۔۔۔ "تخلیقِ نامدار" کہ میرے لیے طرّۂ دستار اور دشمنوں کی آنکھوں میں خار ہے۔ بصد تزک و احتشام کل روز یہاں پہنچا۔ ورق ورق پر تمہاری محبت کی مہر کندہ اور لفظ لفظ میں خلوص کی بوئے جاں نواز بسی ہوئی ہے۔ تم نامۂ غالب بخطِ جلی بصد شان چھاپتے ہو، خود داد دیتے ہو دوسروں کو داد پر اکساتے ہو، گویا مجھے حیاتِ جاوید عطا کرتے ہو۔ فقیرِ غالب کا ہر بنِ مُو تمہارے احسان کا شکر گذار ہے۔ یہ تمہاری مروّت کا نشان میرے پایانِ عمر میں ایک اور سہی!

میاں۔ تمہاری آشفتہ خیالی میں مجھے ہرگز شک نہیں، پر تم نے "اپنی بات" میں مسئلہ ہندوستانی ادیبوں کا پھر کیوں چھیڑا۔ کیا میری بات دل کو نہیں لگی، اور جو چھیڑا تھا تو اس میں پیوند سلطان سبحانی کا کیوں لگایا۔ تم نے از راہِ احتیاط نام نہیں لکھا۔ پر میں سمجھتا ہوں کہ گوجرانوالہ کے شہر سے تم نے اکبر حمیدی کو اور بلدیہ راولپنڈی سے احمد داؤد کو مخاطب

کیا ہے اور نام جن مدیرانِ جریدہ کے صیغہ اخفا میں رکھے ہیں وہ اوّل ڈاکٹر وزیر آغا اور دوم احمد ندیم قاسمی ہیں۔ اس قیافے پر داد دو یا مردود ٹھہراؤ۔ لیکن از برائے خدا اردو کے دیس میں غالب خستہ جان کا داخلہ بند نہ کرو، ہرچند کہ تم نے مسئلہ اہل رائے اور اہلِ ادب کے آگے رکھا ہے اور ارادہ اس ذیل میں تمہارا عمل کرنے کا نہیں اور روش تم نے ان لوگوں کی اختیار نہیں کی جو دوسروں پر حرف زنی اور طعنہ فگنی کرتے ہیں، مگر در پردہ بھارتی ادیبوں سے تعلقات بسلسلہ ترقی پسند تحریک برقرار رکھتے ہیں۔ واللہ باللہ، تم یہ روش اختیار نہیں کر سکتے۔ پھر اس مسئلہ کو کیوں دہراتے ہو اور مجھ کو افسردہ کیوں کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ سخت نا انصاف ہوں گے۔ وہ ادبا جو تمہاری اس تحریر سے افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔

میری جان! تمھیں حق حاصل ہے کہ تم اسے جملۂ معترضہ کہو، پر ما جرائے حقیقت یہ ہے کہ تخلیق کے آنے سے تین طرح کی خوشی مجھے حاصل ہوئی، ایک تو یہ کہ تم نے مجھے یاد کیا، دوسرے بعد مدت مدید ممتاز مفتی کا افسانہ چھاپا کہ مجھے بوڑھے کھوسٹ کے لیے لیکوریا انگلسیہ سے زیادہ محرک و ملذذ ہے، تیسرے اس جریدہ میں برخوردار بیکار خالد احمد سے فقیر غالب کی موانست کا ذکر کیا۔

میاں! کیا سمجھے ہو، سب مخلوقات اظہر جاوید و غالب کیونکر بن جاویں۔ طعنۂ اغیار اپنی جگہ مگر ہماری دوستی تو جنم جنم کی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ

ع: ہر یکے را بہرِ کارِ ساختند!

انت متا سو متا۔ مصری میٹھی، نمک سلونا۔ کبھی کسی شے کا مزا نہیں بدلے گا۔ خوشۂ انگور کو کیکر پر چڑھاؤ گے تو ہر خوشہ زخماؤ گے۔ سو یہ کیفیت عزیز خالد احمد کی ہے۔ جس طرح ذوقِ دشنام اسے دو وسیلوں سے ملا ہے اسی طرح اس کے ظاہر و باطن کی پرتیں بھی الگ الگ ہیں!

اے بھائی! اخبار امروز سے اس کے اخراج پر میں چونکا نہیں تھا۔ دم تحریر یہ شعر زبان پر آ گیا ہے۔ ؎

نکلنا خُلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہ شعر اگر آج لکھتا تو روئے سخن خالد احمد کی طرف ہوتا اور اس میں کوچۂ امروز شامل کرتا۔ یہ تو اس کا مقسوم تھا اور ایک روز سامنے آنا تھا۔ اس کے طور اطوار روزِ اول سے ہی موجبِ پریشانی تھے۔ مُبارک احمد سے چھیڑ چھاڑ، انتظار حسین سے نوک جھونک، انشائیہ کی بحث میں خفگی، ڈاکٹر وزیر آغا سے تکرار، انور سدید پر دشنام، ضلع جگت، پھبتی، دشنام، مزاح اور بذلہ میں حدِ فاصل عدم قائم، حفظِ مراتب اور پاس ادب کا خیال نہیں۔ حضرت احمق پھپھوندوی مجھ سے ملتے ہیں تو دل کو مسوستے ہیں کہ ان کے فرزند اصلی نے ادیبانِ خطہ لاہور سے نکتہ سنجی نہ پائی۔ صرف بوم مزاجی اکتساب کی۔ لاریب حلقہ ارباب غالب میں میرا نام عزت و احترام سے لیتا ہے لیکن یہ سب ظاہر ہے کہ دفتر "فنون" میں پہنچتے ہی قلمی شورہ پو جاتا ہے۔ اور ایک سانس میں سو سو مغلظات بکتا ہے۔ تم بتاؤ یہ "صحبتِ نیک" کا اثر ہے یا تربیتِ غیر کا۔ وزیر آغا اور قتیل شفائی دونوں کو بیک زبان نشانۂ دشنام بناتا ہے۔ اور جو اس کا احوال لکھو تو نظر اس بات پر رکھو کہ اب مجھے اوس شخص سے خس برابر علاقہ عزیز داری کا نہیں رہا۔ دلّی بھاڑ میں چلی گئی۔ حلقۂ اربابِ غالب بھاڑ میں جائیگا تو کیا ہو گا! اللہ باقی، اللہ باقی!

بندہ پرور! میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی نہیں گنتا۔ سب کو عزیز رکھتا ہوں اور بھائی مانتا ہوں۔ خالد احمد اگرچہ ناہنجار ہے لیکن بنی آدم سے ہے اور اولاد حضرت احمق پھپھوندی ہے گو امروز سے اخراج کے بعد شکل خاصی بگاڑ لی ہے پر صورت اب بھی آدمیوں جیسی ہے، تم اس تصویر پر نہ جاؤ جو راغب شکیب نے رسالہ "اُردو زبان" میں چھاپی۔ یہ تصویر تو کسی اور عالم کی ہے۔ ازرہِ اخلاق اسے عزیز اور فرزند دلبند نہیں لکھا۔ یہ میرا طور، میرا طریقہ ہے۔ اودھر سے آدمیت نہ ہوئی تو کیا اوس کو سمجھانا لغو، بے فائدہ بلکہ مُضر ہے۔ نہیں بھائی! فقیر غالب کی روش یہ ہے کہ بدی کے آگے ڈھال نہیں بن سکتے تو نیکی کا راستہ نہ روکو۔ دن کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہ کہو۔ تم اُسے

سمجھاتے رہو۔ صراطِ مستقیم دکھاتے رہو اور جو وہ عظیم انسانوں کی محفل سے اٹھ کر تمھاری مجلس میں آ بیٹھے تو اسے عطیۂ ایزدی سمجھو اور اپنے نو خرید سکوٹر کے پیچھے جگہ دو! ادھر میرا حال سنو! بایں ہمہ خفقان خالد احمد کی صورت دیکھے ایک زمانہ گزر گیا تھا، دل اداس و ملول تھا۔ بارے کل اخبار "نوائے وقت" میں اس کا نام پڑھا اور صورت دیکھی۔ بہ تقاضائے دل چوما، آنکھوں سے لگایا۔ عطاء الحق قاسمی سے ملو تو شکریہ ادا کرو اور کہو کہ خالد احمد امروز بدر ہے اور کسی عہدۂ سرکار پر بھی فائز نہیں، پر حیلے بہانے ادبی ایڈیشن میں ہر جمعہ کو اس کا نام بھی مظہر الاسلام کے نام کے ساتھ درج اخبار کرے۔ فقیر غالب کی رُوح خوش ہوگی اور عطاء الحق قاسمی کو تقویتِ فن اور مقبولیتِ کالم کی دعا دیگی۔

حضرت! میں نے جو شکوہ کیا تھا وہ بے جا نہ تھا۔ اس کی اطلاع عطاء الحق قاسمی کو بھی پہنچی۔ تخلیق بعد میں اور کتاب "روزنِ دیوار سے" پہلے پہنچی۔ چہرہ مہرہ دیکھا۔ صاحبِ کتاب کو سرورق پر روزنِ دیوار سے جھانکتے پایا۔ ہر چند یہ فعل دیارِ دلّی میں عاداتِ قبیحہ میں شمار ہوتا تھا۔ مگر سنا ہے کہ لاہور میں عطاء الحق قاسمی نے اسے فنِ لطیف کا درجہ دے دیا۔ اب ہر شخص اپنی ذات سے چشم پوشی کر رہا ہے۔ اور روزن سے دوسروں کی خلوت میں جھانک رہا ہے۔ سبحان اللہ، واہ وا۔ ورق الٹا تو اچانک اپنے محسن و مربّی ادب پیشہ احمد ندیم قاسمی کی رائے پر نگہ اٹک گئی۔ میاں! انھیں کیا سوجھی کہ مزاح کو شائستگی کی ضد قرار دیا۔ تمھیں مبدءِ فیاض نے ذوقِ لطیف عطا کیا ہے۔ مجھے بتاؤ جو لب پر اک تبسم گلگوں تحریر پڑھ کر بے ساختہ کھل اُٹھے تو تم اسے ناشائستگی کہو گے۔ تمھارے نام میرے رقعات میں جو خندہ ہے وہ کیا خندۂ ناخوشگوار ہے۔ اور رتن ناتھ سرشار اور جوالا پرشاد برق اور نواب سید محمد آزاد کو کیا شائستگی سے علاقہ نہیں۔ دور کیوں جاؤ، شفیق الرحمٰن، پطرس بخاری اور ضمیر جعفری نے جو شگوفے کھلائے ہیں اور کرنل محمد خاں نے میرے اشعار سے جو لذتِ لطیف پیدا کی ہے۔ اس میں ہمدردانہ اندازِ نظر کا فقدان ہے؟ دوست نوازی اپنی جگہ۔ واللہ باللہ احمد ندیم قاسمی کی اس رائے پر انگشت بدنداں ہوں۔ اور تربھون ناتھ ہجر اور

عظیم بیگ چغتائی اور چراغ حسن حسرت اور عبدالمجید سالک سے منہ چھپائے پھرتا ہوں۔ ہجو، پھکڑپن، ریختی اور دشنام کو مزاح سمجھو تو یہ واقعی ناشائستہ ٹھہرے گا۔ لیکن وہ مزاح جو میں نے لکھا ہے اور اب مشتاق احمد یوسفی لکھتا ہے، اس کا ذکر جو تم اپنے کالم "کنارِ راوی" اور "محفل محفل" میں کرو تو اسے ناشائستہ کہو گے؟

ریاض مجید نے لکھا ہے کہ اس نے رونمائی اس کتاب کی فیصل آباد میں کرنے کی ٹھانی اور صدر انور سدید کو چنا کہ ... ب کو پڑھے بغیر تبصرہ بے نظیر کرتا ہے، لاگ سے لگاوٹ پیدا کرتا ہے۔ انور محمود خالد، احسن زیدی نے تقریظیں لکھیں، ایک دوسرے پر گوئے سبقت لی۔ صفاتِ عالیہ سے مزین اور انوارِ معنی سے منور۔ پر یہ سب بیکار گئیں، کیوں؟ عطاء الحق قاسمی نے آخری وقت پر شرکت سے معذوری ظاہر کی۔ اور منتظمین نے جو تعریف ان کے سامنے کرنی تھی وہ ان کی پیٹھ پیچھے کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ پر میں ابھی تک متشوش ہوں، تم پوچھو گے کیوں؟

جانِ غالب! ذرا پتہ کر کے مجھے بتاؤ کہ دبستانِ سرگودھا نے تقریباتِ نمود اور رسومِ نمائش ادبا کے خلاف جو شور مچا رکھا ہے اور راغب شکیب نے اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون "اُردو زبان" میں چھاپا ہے۔ تو کیا یہ اس کا نتیجہ ہے؟ اور کیا عطاء الحق قاسمی جیسے مُصنّفین بالمکین بھی کتاب کی رونمائی اور تعریفِ بے جا سے برگشتہ خاطر ہو گئے ہیں، اس باب میں جو کچھ معلوم ہو بلا تاخیر مجھے لکھو، اگر نہیں تو عطاء الحق قاسمی نے یہ موقعہ زیبائش و نمائش کیوں ضائع کیا؟ یہ سوال میں تم سے کرتا ہوں۔

میری جان! "رونقِ دیوار سے" کی رونمائی بصد تزک و احتشام کرنے کا خیال مجھے بھی ہے۔ ایں جہانی منشی شیو نرائن آرام، جواہر سنگھ جوآہر، نبی بخش حقیر اور بدرالدین فقیر کہ میرے دمساز و دمباز ہیں۔ اس پر اصرار کرتے ہیں۔ راتے ان کی میری نظر میں وقیع اور بامعنی ہے۔ کہ اس بہانے فقیر غالب کا بھی کچھ چرچا ہو۔ غزل میری "نوائے وقت" میں جگہ پائے، تصویر میری دور دور تک پہنچے۔ حسینانِ پاک مجھے تعریف سے سرشار کریں، عمر میری دوگنی ہو، چوگنی ہو، مزید تقاضا احباب کا یہ بھی ہے کہ

گلزار وفا چودھری اور امجد اسلام امجد ہم رکاب کتاب و مصنف ہوں۔ خلد آباد کے لوگ انھیں دیکھنے کے لیے مشتاق ہیں اور جو یہ دونوں صاحبان فرخ مقام یہاں حور و غلمان کے درمیان قیام دوام فرمائیں تو چشم ما روشن دل ما شاد، ایک کمرہ کسی نہ کسی طرح کہ ملحق بہ غسل خانہ ہو ان کے لیے بہم کراؤں، ساقی و شرابِ طہور ہمہ وقت حاضر! بھائی! یہ بات میں نے تم کو بشرطِ اخفا لکھی ہے۔ تم عطاء الحق قاسمی سے بصیغۂ راز بات کرو اور تاریخ موزوں مقرر کرکے مجھے اطلاع دو تاکہ انتظام طعام و قیام بدرجہ اعلیٰ کروں اور تمھارے کالم میں داد پاؤں، نیز مرار جی ڈیسائی سے کہہ کر نام ان سب کا ناپسندیدہ شخصیتوں کے بستے سے خارج کراؤں۔

جمعہ کے دن آٹھویں ستمبر کو دوپہر کے وقت منشی تلوک چند محروم میرے پاس تشریف لائے اور تمھارے فرستادہ "نوائے وقت" کے بہت سے پرچے مجھے دکھائے۔ ایک میں فرزندِ دلبند محروم جگن ناتھ آزاد صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی کشمیر کا خط در مدح عطاء الحق قاسمی دیکھا۔ ایک پرچے میں جوش ملسیانی الموسوم بہ پنڈت لبھو رام کی باتیں چھپی تھیں۔ امرتسر کی صاحبِ جمال خاتون کلدیپ کلینا نے تحسین کا نیا انداز نکالا۔ ایک بیت جو درج ذیل ہے بطریقِ خود سپردگی بخط گورمکھی لکھ کر پاکستان بھیجا۔ ؎

بچھڑ کے تجھ سے ملے اور بھی تجھ ایسے لوگ
مجھے یہاں کوئی تجھ سا دکھائی دیتا نہیں

ترجمہ اس کا سلیم رفیقی نے راولپنڈی سے کیا۔ علیم ناصری نے لاہور سے، بیگم مقبول ربّانی نے گوجرانوالہ سے اور میاں غلام باری نے گجرات سے بھیجا۔ تب کھلا کہ یہ شعر تو عطاء الحق قاسمی کا اپنا ہے۔ تفصیل اس قصّے کی بھی انھوں نے اپنے قومی اخبار میں چھاپی۔ دل خوش ہوا کہ شہرت عزیزی کا جھنڈا اکنافِ ہند میں گڑ گیا۔ باتیں اس کی زبان زدِ زنانِ ہند اور فن اس کے کا لفظ لفظ بیرونِ ملک

قیمت گراں پا رہا ہے، پھر انعام الحق جاوید نے کیوں لکھا کہ عطاء الحق قاسمی بیرونِ ملک اچھی شہرت کے حامل قرار نہیں پائے۔ بھائی! میں یہ معمہ نہیں سمجھ سکا۔ اور جو تم پر کھلا ہو تو بلا کم و کاست مجھے لکھو۔

سنو! صوبہ اودھ اور بہار کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب کے احاطے میں گئی ہے۔ ان میں میرا فرزند دلبند سراج منیر بھی شامل ہے۔ شاعر، افسانہ نگار، غزل گو، اپنی شخصیت کی نفی تحریر میں کرتے ہیں۔ یہ عزیز تقریر میں کرتا ہے حلقہ اربابِ ذوق ادبی ہو یا سیاسی اس کی تقریر کے بغیر رنگ نہیں پکڑتا تم نے درست لکھا کہ سراج منیر صاحبِ مطالعہ نوجوان ہے۔ بہت پڑھتا ہے اور بیشتر ہضم بھی کر لیتا ہے۔ پھر تم نے خواجہ زکریا کے بیان پر کیوں یقین کیا کہ سراج منیر جوشِ بیان میں غیر متعلق حوالے دے جاتا ہے اور غلط کتابوں کے نام بتا جاتا ہے۔ میری دل شکنی ہوتی، سراج منیر کا حال کیا ہوگا، تم سے ایسی توقع نہ تھی۔ میاں سنو! سراج منیر گفتار کا غازی ہے، زبان کی نرت سے بازی کھیلتا ہے۔ بس اس کی داد دو۔ یہ نہ دیکھو کہ کتاب کا نام یا حوالہ غلط اقتباس ہوا، مناظرہ، مباحثہ اور گفتگو حلقہ میں سب جائز ہے اور جو تمھارے شیشۂ خلوص میں اس کے بارے میں بال آگیا ہے تو اس کو نکال دو۔ اس کے علم و فضل اور عقل و دانش کی شہرت دور دور تک پہنچاؤ، عزیز الحق اور عارف امان اور محبوب لڈو کی مسند پر اسے بٹھاؤ۔ اسے نصیحت نہ سمجھو۔ میرا حکم کہو کہ قلم تمھارا فضیحت پر اترا ہے اور یہ مجھے پسند نہیں۔

بھائی! تم نے سنا کہ گلزار وفا چودھری نے گندگی کا ٹوکرا اب عبدالعزیز خالد اور کشور ناہید پر پھینکا۔ عبدالعزیز خالد نے اس پر خط لکھا اور شکریہ ادا کیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اگلے ہفتے اس کی غزل ادبی صفحے پر شائع ہوتی۔ راولپنڈی میں قومی ادبی تحریک کا شاخسانہ اٹھ کھڑا ہوا۔ صدارت پہلے جلسے کی احمد ندیم قاسمی کو سونپی، مہمانِ خصوصی ڈاکٹر وزیر آغا کو بنایا لیکن دونوں حضرات بوجوہ جلسے میں حاضر نہ ہو سکے جو لوگ وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کی باتیں سننے کے لیے گئے تھے۔ ان کے پلے احمد فراز اور اختر امان پڑے۔ اے بھائی! قومی ادب کے مسائل اب یہ لوگ سلجھائیں گے؟ ہیہات، ہیہات، اخبار میں لکھا

تھا کہ احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا دونوں نے قومی ادب کے مسئلے پر زبان بندی کر رکھی ہے۔ عدم شرکت جلسہ سے یہ بات بھلا کیسے نکلی، یہ ہوائی اختر امان نے اڑائی ہے؟

اب کے تم نے حورانِ پاک کی تصویریں نہیں چھاپیں۔ تخلیق اتنا پھیکا تو کبھی نہ ہوا تھا۔ اچھی تصویر میرے لیے کحل البصر ہے۔ زنہار یہ کوتاہی پھر نہ کرنا۔ اس وقت کوٹھڑی میں بیٹھا ہوں، ہوا آرہی ہے، پانی کا جھجر دھرا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں، یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا۔ یہ باتیں کرلیں۔ اے لو وہ مولانا ماہر القادری آگے آگے اور طاہر فاروقی پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ ع اے آمدنت باعثِ خوشنودیِ ما!

خط ختم کرتا ہوں۔ اللہ، اللہ، اللہ!

جمعہ ۹ ستمبر ۱۹۷۰ء، ۲۵ شوال ۱۴۳۸ھ

نجات کا طالب، سگِ دنیا علیؑ

اسد اللہ خاں غالب

۷

منشی صاحب! سعادت و اقبال نشان اظہر جاوید صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ!
غالبِ خستہ جاں کی دعائے درویشانہ قبول کریں۔ ہم تو آپ کو میکلیگن روڈ پر دفتر "تخلیق" میں سمجھے ہوئے ہیں اور حضرت جناب رتن چند کی حویلی میں مطبع "امروز" اخبار میں بیٹھے ہوئے چائے اور حقّہ لاہوری پی رہے ہیں اور ہارون سعد اور مسعود اشعر سے اور منّو بھائی الموسوم بہ منیر احمد قریشی سے باتیں کر رہے ہیں اور جو چائے اور حقّہ سے فرصت پاؤ تو بھلا مسعود اشعر صاحب کو میرا سلام کہنا اور بتانا کہ سامعہ بہرا ہو گیا تھا اور اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا ہے۔ پر میں نے کتاب ان حضرت کی کہ عنوان "آنکھوں پر دونوں ہاتھ" ہے اور مجھے بر بنائے محبت و عقیدت فراواں بر رشتہ ڈاک بھیجی گئی ہے۔ باصرہ اور قلب کے قریں رکھ کر پڑھی۔ داستان، کہانی، قصّہ، افسانے سے کبھی رغبت وافر تھی۔ باقر علی داستان گو میرے مربی و محسن تھے۔ فسانۂ آزاد والے رتن ناتھ سرشار ہم مجلس اور ہم صحبت ہیں۔ لیکن اب حالت دیگر ہے۔ بھلا جس نے دلّی کو لٹتے اور اجڑتے دیکھا ہو۔ اس کا دل قصے کہانی میں لگ سکتا ہے۔ مسعود اشعر کے قصّے ہر چند تجرید اور علامت کے پیکر ہیں۔ پر میرے دل میں اتر گئے۔ آنکھوں سے سیلاب خون جاری ہوا۔

مشکیزۂ ابر پھٹ گیا۔ لگتا ہے ایک دلّی مسعود اشعر نے بھی اجڑتے دیکھی ہے۔ قصّے اس شخص کے نے میرے دل کو مسوس لیا۔ جگر کو چھیدا۔ پھر حقہ تازہ کیا۔ مصطفیٰ خاں شیفتہ کو غزل سنائی۔ خط لکھ رہا ہوں، گویا دل ہلکا کر رہا ہوں۔ سنا ہے پاکستان میں قحط الرجال ہے۔ آدمیوں کا کال ہے۔ پر جو کام تمھارے حال میں مسعود اشعر لے گیا اور اپنی مسند پر تمھیں بٹھایا قسمت علمی و ادبی کا مدیر مقرر کیا۔ اس کی مثال کوئی اور پیش کرو گے اور اس کا شمار کس زمرے میں کرو گے۔ واللہ میرے زمانے میں ایک بھی شخص ایسا ہوتا تو دلّی لٹتی؟ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے غالب خستہ روگردانی اختیار کرتا؟ اور قصیدہ انگریز بہادر کا لکھتا؟ بھائی صاحب! یہ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ میرے یارِ دیرینہ اور محرمِ پارینہ ہو۔ لاگ میں لگاؤ پیدا کرتے ہو۔ بتاؤ!

سنو! یہاں دلّی میں ایک اصطلاح نئے نوّاب کی ہے۔ اور یہ لفظ عام ہے۔ ہندو ہو یا مسلمان اس پر صادق آتا ہے صورت یہ کہ جہاں کوئی شخص دولت مدار سریر آرائے اقتدار ہوا۔ غرض مند، حاجت جو اور کاسہ لیس لوگ فراہم ہوئے اور اوس کو خداوندِ نعمت اور جناب عالی کہنا شروع کیا۔ فلانی زنِ عربدہ جو آپ پر مرتی ہے۔ فلانا امیر اپنی مجلس میں آپ کی یوں تعریف کر رہا تھا۔ فلاں اخبار نے آپ پر تقریظ چھاپی۔ آپ کا کلام سبحان اللہ! ایک مسند اقتدار کہ نام اس کا ماہ نامہ "تخلیق" ہے۔ تمھارے پاس پہلے تھی۔ اب دوسری بصورت ادارت اخبار "امروز" تمھیں تفویض ہوئی۔ طلب گارانِ اشاعت و شہرت مثل مکھیوں کے تمھارے گرد بھنبھنائیں گے۔ تمھیں بنائیں گے۔ تعریف میں طلاقتِ لسانی اور توصیف میں جادو بیانی فرمائیں گے۔ گویا کاشانۂ دل کا ماہِ نو میرزا اظہر جاوید لالہ رتن چند کی حویلی میں پہنچتے ہی ماہِ نیم ماہ ہو گیا ہے۔ زنہار منافقت ان لوگوں کی میں نہ آنا اور مثل دوسروں کے شامیانۂ شہرت میں پناہ حاصل نہ کرنا اور جو تمھاری نثر کی اور نظم کی اور صحافت کی اور ادارت کی تحسین فیّاضی سے کریں اور تقاضا "محفل محفل" کی اشاعت کا بصورت کتاب کریں تو اسے خود اپنی نگہہ تنقید جُو سے دیکھنا اور جو اس کی فرصت نہ ہو تو ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی طرف رجوع کر کے ان سے رائے صحیحہ طلب کرنا کہ یہ اگلے زمانہ کے لوگ ہیں اور ہر حال میں صداقت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ تنقید

ہیں رشتہ قرابت اور دوستی کو قریب نہیں آنے دیتے۔ دور کیوں جاؤ۔ غالب نکتہ آفریں کو دیکھو کتنا شہرت پسند ہے۔ نوائے وقت کو غزل بھیجے تو گلزار وفا چودھری کی تعریف میں قلابے ملاتا ہے۔ اور جو "امروز" میں کوئی چیز مرسل ہو تو خالد احمد کا قصیدہ ہم رشتہ خط کرتا ہے۔ قلمی شورہ کے پردے میں چھپ کر امجد اسلام امجد نے درست لکھا ہے کہ امسال اس مغاں شیوہ نے مدیرانِ جریدہ کو سب سے زیادہ خطوط لکھے اور سال آئندہ مزید لکھنے کا ارادہ کرتا ہے اب تم سے طلبگار اعانت ہے۔ غزل، مثنوی، قصیدہ، خط تمھیں بھیجتا ہے اور تقاضا بہ عجلت اشاعت کا کرتا ہے اور جو ساتھ تصویر شائع نہ ہو تو بسورتا ہے۔ راغب شکیب کو بر بنائے ادارت "اُردو زبان" ادیبِ شہیر کہتا ہے۔ سو میاں! اپنے بارے میں رائے مجھ بندۂ مقاصد سے بھی طلب نہ کرنا کہ ملوّث بہ مقصد اشاعت ہوگی۔ اور ہاں اخبارِ "امروز" میں حورانِ پاک کا اجتماع لطیف زیادہ نہ کرنا۔ شہرت تمھاری اس باب میں دُور دُور تک پہنچ چکی ہے اور یہ محفل تخلیق میں خوب سجتی ہے۔ واللہ باللہ! زمان کنجاہی، تنویر ظہور، ڈاکٹر تبسم رضوانی، پروفیسر طاہر تونسوی کو زنہار نہ بھولنا کہ یہ تمھارے ہم نفسانِ دیرینہ ہیں اور تادیر تمھارا ساتھ دیں گے۔ اور جب تک موقع پیدا نہ ہو وار نہیں کریں گے۔ یہ چند باتیں بر بنائے ہمہ روی و دلنوازی قلم پر اور زبان پر آگئیں۔ ان پر عمل تمھاری مرضی پر موقوف ہے۔ ایک غزل کہ چھ بیتوں پر مشتمل ہے۔ لف ہٰذا کرتا ہوں۔ اسے بہ تعجیل چھاپنا معہ میری شبیہہ سابقہ کے۔

حضرت! تم سے ایک بات بصیغۂ راز کرتا ہوں کہ غالبِ خستہ تمھارا ممنون اور احسان مند ہے اور تعظیم بجا لاتا ہے تم نے اپنے عالم آشکار جریدہ میں میرے خطوط مکتوبات اور مراسلات چھاپے۔ میرے طرزِ سخن کو مکرّر جاری کیا۔ اگرچہ انجام کار مورد ستم ہائے تضحیک ہوئے۔ "تخلیق" گزشتہ میں جو آشفتہ خیالی گلزار وفا چودھری کے باب میں ہوئی کیا واجب تھی؟ اور جو خالد احمد کو موضوعِ مکتوب بنایا کیا مناسب تھا؟ یہ دونوں حضرات علیٰ قدر مراتب بہ نسبت حضرت احمد ندیم قاسمی و حضرت احمق پھپھوندوی مجھے نواب زین العابدین عارف کی طرح عزیز ہیں۔ میں انھیں اپنا فرزندِ معنوی ایک واسطے سے اور مونس و دمساز دوسرے واسطے سے شمار کرتا ہوں خط و کتابت میری ان سے مسلسل جاری ہے۔ وہ میری غزل کی تعریف کرتے ہیں۔ میں ان کے

کالم کی داد دیتا ہوں۔ ان پر طعن، طنز، بذلہ، پھبتی کو گناہ سمجھتا ہوں اور جو یہ خود غالبِ خستہ کو بہ نگاہِ کج دیکھیں۔ اور مشکیزۂ ابر پھاڑ کر سمجھیں کہ مزاح ہو رہا ہے۔ اور اخبار میں اس کا ذکر برملا کریں تو اس کا ہرگز ملال نہیں کرتا۔ کیوں۔؟ ؎

"فرزندِ شہ" سے ہو مجھے پرخاش کا خیال

یہ تاب یہ مجال یہ طاقت کہاں مجھے

اے میاں! لڑکے مجنوں پر سنگ نہ اٹھائیں گے تو انھیں اپنا شیشے کا گھر کیونکر یاد آئیگا۔ عزیز گرامی طولعزہٗ کا شکوہ مجھ تک پہنچا۔ میں نے انداز بالواسطہ اختیار کیا۔ بات سے بات نکالی۔ روزمرّہ سے مزاح بطریقِ واسطہ پیدا کیا کہ روئے سخن جس کے بارے میں ہے اسے نہ چبھے اور جو دوسرا کوئی پڑھے تو مسکرائے بغیر نہ رہے۔ واہ کیا روایات کیا حکایات بیان کی ہیں۔ کیسے کیسے مطالب و معانی نکالے ہیں۔ لاریب اس طور گلزار وفا غالبِ خستہ کے بارے میں لکھتا تو داد دیتا۔ قلم کو چومتا، اپنے نطق سے اس کی زبان کے بوسے لیتا۔ پر میرے فرزند دلبند خالد احمد کا سامعہ اور شامہ مختلف ہے اس لیے اس کا ناراض ہونا بجا! اور جو مزاح کو فضیحت سمجھتا ہے تو دوست ان سے کہو کہ نام اس عزیز کا آیندہ زنہار زبان پر نہ آئے گا۔ اور جو ادھر سے دشنام، پھبتی اور جگت ہو تو رنجیدہ نہ ہو۔ عمر کی اس منزل میں کہ دماغی قویٰ مضمحل ہوئے یک صد و تیرہ سال ہو گئے پر سچ کہتا ہوں۔ تخلیقی دشنام کے لیے کان ترستے ہیں۔ بیٹی میری نہیں، بہن میری نہیں، ماں کی گالی مجھے لگتی نہیں۔ پیشے کی نسبت سے قتیل شفائی اور شمیم احمد اور امجد اسلام امجد اور صابر ظفر سب دشنام آزما چکے ہیں۔ اب کونسی گالی نئی تصنیف ہو گی کہ میرے دل کو رنجیدہ کرے گی۔ اے میاں! جو اچھی گالی مجھے دیں گے تو میں خوش میرا خدا خوش۔ بندگی کروں گا۔ کورنش بجالاؤں گا۔ تخلیق دشنام پر شکریے کا خط لکھوں گا۔ خدا یہ روزِ سعید جلد لائے۔ دُعا کر رہا ہوں۔

بھائی! یوں سمجھو کہ مزاح کو سمجھنا اور اس پر داد دینا طلب گار ظرف ہے۔ میں نے جو آنکھوں کو ویران کیا ہے تو اس عادت کی بنا پر اور اب جو تیکھے اور نوکیلے جملے کو ترستا ہوں تو اہلِ عالم کے شوق کے اس فقدان کی وجہ سے خدا بھلا کرے انتظار حسین کا۔ مجھے اپنا کالم

نہیں بھیجتا۔ امرو ہے کی تل شکری مرسل کرتا ہے۔ میرے بجھتے ہوئے دل کو حرارت مہیا کرتا ہے۔ تمہارے ملازم سرکار ہونے پر اس نے کیا مضمون تراشا ہے۔ میری غزل کا یہ مصرعہ مطلع اخبار بنایا ہے۔ ع

وہ دن گئے کہ کہتا تھا نوکر نہیں ہوں میں

ناصر کاظمی کی برسی پر جو کالم اس نے لکھا تھا اس کی یہاں دھوم ہے۔ سرور مجاز کی تقریب پر اُس نے کیا مضمون باندھا کہ

"سراج منیر اور عطاء الحق قاسمی ادبی تقاریب میں ایک دوسرے کی تلافی کرتے ہیں اور مل کر عالمانہ ثقاہت اور ظرافت کا مزاج پیش کرتے ہیں۔ ایک کا کلام آہ ہے اور دوسرے کا واہ....."

تربھون ناتھ ہجر اور منشی جوالا پرشاد اور رتن ناتھ سرشار میرے پاس بیٹھے ہیں۔ اے لو میں نے یہ قصہ ان کے گوش گزار کیا۔ وہ دیکھو ان خندہ نگاروں کے لبوں پر غنچۂ تبسم لہلہایا۔ واہ وا۔ میں تم سے پوچھتا ہوں اس پر لاہور میں کسی نے انتظار حسین پر قرولی تو نہیں نکالی۔ یہ معنی آفرینی اس کا حصہ ہے۔ اور بغیر سحر خیزی کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ جو تم اس سے ملو تو میرا سلام کہو اور کہو کہ غالب تمہارے نکات کا گرویدہ ہے۔

ایک خبر بہ زبانِ طیور کے یہاں پہنچی کہ عزیزی سراج منیر کا اعتماد اس جوانی میں مغربی علوم سے اُٹھ گیا ہے اور اعلان اس کا بہ اعتراف بے شرمی اس نے لوہاری دروازے والے حلقہ اربابِ ذوق میں کیا کہ اب یہی ایک جگہ اس قسم کے اعلانوں کے لیے دستیاب ہے۔ قیوم نظر، سید امجد الطاف، اور رحمان مذنب نے خموشی میں مصلحت سمجھی۔ البتہ داد شیر محمد گریوال صاحب نے دی اور تنقید پروفیسر عبدالرؤف نے کی۔ میں حیران ہوں کہ یہ کیوں اور کیسے ہوا؟ میاں سنو! علوم مشرق کے ہوں یا مغرب کے گرہ کشا ہوتے ہیں اور مثل سورج کے سفر کرتے ہیں کبھی مشرق میں کبھی مغرب میں۔ اور جو ان سے آنکھیں موند لو گے تو گویا اپنے دل کو اور اپنی عقل کو مہر بستہ کر دو گے۔ میرے زمانے میں سید احمد خاں آئینِ اکبری کی تصحیح کرتا اور آثار الصنادید لکھتا تھا۔ لیکن راجہ رام موہن رائے نے ہندوبرہما کو نئے علوم کی طرف راغب کیا۔

میں نے دل مسوس کر سیّد کو کہا: "حضرت دیکھو! علوم کی جو شمع ابن رشد، ابن طفیل اور ابنِ ماجہ اور ابنِ خلدون مشرق سے مغرب میں لے گئے تھے اب واپس ہندوستان میں آ رہی ہے۔ پرانے آثار مٹ رہے ہیں، نئے ہویدا ہیں:

"اُٹھئے کہ اب وہ لذّتِ خوابِ سحر گئی"

بِللہِ الحمد سیّد نے میری آواز پر کان دھرا، ہر چند داغِ فراقِ صحبتِ شب کی شمع جل چکی تھی۔ پر اس مردِ خوش خصال نے مجموعۂ خیال کو فرد فرد ہونے سے بچایا۔ نئے انکشافات اور علوم پر اپنا سینہ کھول دیا۔ تم سیّد کو نیچری مسلمان کہو تو مجھے ملال ہرگز نہیں۔ پر دیکھو کہ غدر کے بعد پاکستان کا پہلا بیج ہندوستان میں کس نے بویا؟ ولیم میور کی دل آزاری کا وار کس نے سہا؟ اور مسلمانوں پر علوم کا دروازہ کس نے کھولا؟ اب سراج منیر کیا ان کھلے ہوئے دروازوں کو بند کرنے کے درپے ہے؟ زبان محض درازکی۔ مردِ حق آشنا سیّد احمد خاں کو "صاحب گموڈ" کہا۔ ہیہات، ہیہات! میں نے جمال احسانی کے جریدہ "اظہار" میں اس کا مکرر بیان پڑھا ہے کہ اب عزیز موصوف نے اپنے بیان میں ترمیم بھی کرلی ہے اور مغرب کو پورا مسترد کرنے کا ارادہ فی الحال ترک کر دیا ہے۔ الحمدللہ! وہ بقراطیت جو سلیم احمد پر بڑھاپے میں آئی تھی اس عزیز نے اپنے اوپر جوانی میں اوڑھلی ہے۔ اور جو بقراطیت وقت سے پہلے آجائے تو یہی ہوتا ہے۔ اے میاں! اگر لوگ سلیم احمد اور شہزاد احمد کو سن کر اور اقتباس کر کے ادیب بن سکتے تو میں اور تم بھی طبقۂ ادبا میں شمار ہوتے۔ ہم دونوں سے زیادہ ان کو کس نے سنا ہے؟ اے بھائی! ادیب کہلانے کے لیے تو آنکھوں کا پانی صرف کرنا پڑتا ہے۔ جان مارنی پڑتی ہے اور میں پوچھتا ہوں کہ انتظار حسین کلچری مسلمان ہے تو سراج منیر کیا انگریزی مسلمان ہے کہ وہ خود راوی ہے کہ اس نے مشرق کے بجائے انگریزی گہوارے میں تربیت پائی۔ جو انگریزی نہ جانے اسے جاہل کہتا ہے اور مضمون میں جب تک انگریزی مصنفوں کے دو چار نام شامل نہ کرے، اس کا اعتماد قائم نہیں ہوتا۔ واللہ یہ کیا تضاد کی باتیں ہیں۔ کچھ سمجھے ہو تو مجھے بتاؤ! اور نہیں تو ڈاکٹر سلیم اختر سے نفسیاتی تجزیہ کراؤ کہ مرض انفرادی ہے یا پوری قوم اس

مرض میں مبتلا ہے۔ سلیم اختر، ایسی امراضِ مخصوصہ کا ڈاکٹر ہے۔

حضرت! طاہر فاروقی صاحب داخلِ خلد ہوگئے۔ پرسوں غریب خانہ پر قدوم میمنت لزوم فرما ہوئے، میں نے پاکستان میں اس لہر کا دریافت کیا جو موسوم بہ "قومی ادب" ہے۔ فرمانے لگے کہ یہ لہر اب مدھم پڑ گئی ہے۔ دیارِ لاہور میں یہ چارپائی محمد طفیل صاحب نقوش نے چار آدمیوں ــــ عطاء الحق قاسمی، سراج منیر، امجد اسلام اور سلیم اختر کے کندھے پر رکھی، مژدہ سنایا کہ ان میں سے سید احمد خان پیدا ہوگا۔ اقبال اٹھے گا اور خود بری الذمہ ہوگئے۔ کتنا اچھا ہوا۔ پر تم نے اخبار "حریت" میں گڑا مردہ کیوں اکھاڑا۔ اور یہ استفسار کیوں کیا کہ یہ بحث حسن عسکری کے زمانے میں بھی چلی تھی۔ کیسا کیسا نکتہ اٹھا تھا۔ اور کون کون لوگ یہ نکتے لائے تھے۔ تمھاری بات انتظار حسین لے اڑا۔ جن پردہ نشینوں کو تم نے چھپایا تھا۔ ان سب کے نام زبان زدِ عام ہوگئے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے پوچھا: "قوم کہاں ہے؟" امجد اسلام نے اشارہ پنجاب آرٹ کونسل کی طرف کیا کہ شہرتِ عام اور رزقِ دوام کی ماخذ ہے اور وقت مناسب پر محمد طفیل کے کیے ہوئے سے روگردانی اختیار کی۔ اور زرعی علاقے میں اجناس کی کمی کا مسئلہ اٹھایا۔ تیسرے صاحب سراج منیر! سو انھوں نے قومی ادب کی چارپائی رکھ دی۔ اور سید احمد خاں کے انہدام کی مہم شروع کر دی۔ اے میاں! اب اکیلا چنا کیا بھاڑ جھونکے گا؟ عطاء الحق قاسمی سے یہ چارپائی کیسے اُٹھے گی؟ سنا ہے یہ شاخسانہ اب اسلام آباد میں بھی مدھم پڑ گیا ہے اور قومی ادبی تحریک کہ تمھارے ہمدم دیرینہ اختر امان نے اٹھائی تھی۔ بس ایک جلسے کے بعد ختم ہوگئی۔ یارانِ سرِ پل نے اس کا ناتہ عوامی ادبی تحریک سے جوڑا اور اختر امان کا رشتۂ تخلیق فخر زمان کے ساتھ قائم کیا کہ اس میں ادب کم اور مقصد برآری زیادہ تھی۔ ایسے میں تم نے اچھا کیا کہ مزید طول اس بحث کو اخبار "امروز" میں نہیں دیا۔ پروفیسر طاہر تونسوی نے اس مجلس میں ذاتیات کی چنگاری چھوڑی تھی پر تم نے تو کبوتر کو رومال سے بھی نکلنے نہ دیا اور پر تینچ کر دیے انور سدید کا جوابی مضمون مسترد کر دیا۔ اچھا کیا۔ وہ اسی قابل تھا۔ اے بھائی! اس نے برا تو نہیں منایا۔ اور گرز سدیدی تم پر تو نہیں گھمایا؟ اگلے روز ڈاکٹر سید عبداللہ گویا تھے کہ میں اس شخص سے بہت ڈرتا ہوں، سچی بات بلا تامل اور بلا روک

ٹوک کے کہتا ہے۔" تم نے سنا کہ اس نے طاہر تونسوی کے استاد گرامی ڈاکٹر سلیم اختر کو ناراض کرلیا ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر کی تاریخ چھپ گئی ہے۔ ادب کے دبستانوں کو خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ یہ کتاب مجھے ابھی نہیں ملی۔ جو تم دیکھو تو مجھے لکھو کہ ذکر میرا اس کتاب میں شامل ہے یا وہ قلمزد ہوگیا ہے۔

اے حضرت! تم کو معلوم ہے کہ سلیم اختر مجھ سے بھی خفا ہے۔ وجہ؟ میں تنقید کو فرضِ منصبی سمجھتا ہوں اور دوست نوازی کا خیال روا نہیں رکھتا، اس کا صلہ مجھ کو یہ ملا کہ آپ ناخوش ہوگئے۔ اور دوستوں کو کہا کہ میری ہجو ملیح کی ہے۔ "تمھاری جان کی قسم! کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔" غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ میرا عذر بجا اور ان کا غصہ بے جا ہے۔ آپ کو معلوم رہے اور جو اس پر بھی وہ میرا ذکر خارج از کتاب کریں تو یہ موقوف بہ مرضی ان کی ہے کہ وہ زندنگاروں کے جلو میں بیٹھے اور ان سے تعریف بے جا سن کر اپنے سابقہ بیانات میں ترمیم کریں یا غور اس امر کا کریں کہ اب اس کا محل کہاں ہے اور ان کی تنقید کے بارے میں اہلِ علم رائے کیا قائم کریں گے؟

صاحب بندہ! یہ بات یونہی بر سبیل تذکرہ قلم پر نہیں آئی۔ اس کا ایک پس منظر ہے۔ میں وہ آپ کے گوش گزار کرتا ہوں۔ جب سے سرکار نے سلیم احمد کو ذرائع ابلاغ کا مشیر مقرر کیا ہے میں خوف زدہ ہوں — پاکستان میں غالب خستہ کو اپنی عافیت نظر نہیں آتی، تم اس بات کو یوں سمجھو کہ سلیم احمد میر پسند ہے۔ غالب دشمنی اس نے محمد حسن عسکری سے ورثے میں پائی ہے۔ موقعہ ملے۔ محل ملے وہ مجھ پر وار کرنے سے نہیں چوکتا۔ وہ کتاب جو اس نے میرے فرزندِ معنوی اقبال پر لکھی ہے کیا تم نے ملاحظہ کی ہے؟ بنے سخن اقبال کی طرف رو ئے تلوار میری طرف۔ حق بات میرے بارے میں اس کی زبان پر اور قلم پر نہیں آتی۔ اے بھائی! جو قلم کار، ادیب، شاعر، سخن نواز اس کے گرد گھیرا ڈالے، زبانِ طمع اور دستِ طلب دراز کیے کھڑے ہیں۔ وہ مجھے کب اہمیت دیں گے۔ میں نہ عابد نہ زاہد، صلحا میں نہیں، فقرا میں نہیں، حلقہ اور توجہ اور مکالمہ اور مکاشفہ اور اذکار و اشغال اور مسائل توحید و تصوف کا بیان یہ سب باتیں بر سبیل شعر میں نے کہی ہیں پر مجھے میر کا انداز نصیب نہیں ہوا، ذکر و شغل اور تعلیم و تلقین و اوراد کہاں؟ اب ریڈیو اور ٹیلی ویژن میرے لیے علاقہ ممنوعہ ہیں۔ میری غزل ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم کی زبان اور استاد امانت علی کے لحن پر بھلا کیوں آئے تم میرے یار ہو، دلدار ہو، جو مشورہ دو تو

معاملہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بہادر و صدرِ مملکتِ عالیہ پاکستان جناب محمد ضیاء الحق اعلیٰ مقامہٗ کی کچہری میں گزار دوں۔ کاش یہ عہدہ حبیبِ لبیب احمد ندیم قاسمی کو ملتا، میرے سارے دلدر دور ہو جاتے۔ گویا مجھے بساطِ اقتدار مل جاتی۔ تم سے اس باب میں جو کچھ ممکن ہو بلا تاخیر کرو اور سلیم احمد کا دل میری طرف سے صاف کرو۔ اور جو ایک آدھ مضمون تقریظ یا دیباچے کے طلب گار ہوں تو فی الفور مجھے لکھو، بھائی دیباچہ لکھنا کیا آسان ہے۔ کلیجہ کو چبانا پڑتا ہے۔ نثر کی فکر نظم سے کم نہیں، پروے حضرت جو راضی بہ مصالحت ہوں تو میں ان کی کتب زیرِ تصنیف پر دیباچہ توصیفی لکھنے کو تیار رہوں۔

میاں! مکتوب سابقہ میں جو میں نے افسانہ نگار غلام الثقلین نقوی کو سفرنامہ نگار لکھا تھا تو وہ بطریقِ تحریف اور برسبیلِ مزاح تھا۔ مضمون ان کا "لاہور سے لوڈو وال تک" سفرنامہ نہیں۔ سفرنامہ کی تحریف ہے۔ طاہر تونسوی اس پر ناحق خفا ہوا اور غصّہ دبستانِ سرگودھا پر نکالا۔ سنا ہے کہ اب وہ ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "اردو ادب میں طنز و مزاح" اپنے نام سے چھپوا رہا ہے۔ اس معاملہ میں وہ تجربہ کہنہ سال و دیرینہ رکھتا ہے۔ تم پوچھو گے کیسے؟ میں عرض کروں گا کہ پہلے اُن نے چند پارہ ہائے مزاح وزیر آغا کے اپنے نام موسوم کئے۔ نیاز فتح پوری کا نام نکالا۔ ابو طاہر کا نام درج کیا۔ وزیر آغا چپکے ہنستے رہے کہ یہ ادیب شہیر کیا کرتا ہے سو حوصلہ اس کا بلند ہو گیا۔ اور اب وہ چراغ بکف دلآزارانہ دزد نگاری پر آمادہ ہے۔ گویا کرشمہ نیا پیدا کرتا ہے۔ اعوذ باللہ من....

اے بھائی! اخبار امروز میں اختر ممونکا کے "زادِ سفر" کو دیکھ کر طبیعت کھل اٹھی ہے۔ واہ کیا حسین ثمر ہے اس جادہ پیمائی کا۔ اب عطاء الحق قاسمی اور محمد کاظم سے کہو کہ وہ بھی اپنے اپنے زادِ راہ کی رونمائی کریں۔ یہ کام صرف تم کروا سکتے ہو۔ علی گڑھ سے سال گزشتہ شہریار نے مجھے اپنا مجموعۂ کلام "ساتواں در" بھیجا تھا۔ دیدہ و دل روشن ہوئے۔ اسی نام سے ایک کتاب کہ تصنیف امجد اسلام امجد کی معلوم ہوتی ہے۔ کل ڈاک سے ملی۔ میں نے جستہ جستہ دیکھی ہے شاعری کیا ہے بس قلمی شورے کی ڈلیاں ہیں کہ پڑھتے ہی قلب و جگر زمہریر ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب کیا، مطبع کے بجائے محمد کاشف کے برف خانہ سے چھپی ہے؟

لو بھئی! آٹھ بج گئے۔ نو بجا چاہتے ہیں۔ تم رتن چند کی حویلی میں دفترِ "امروز" جاؤ، میں ابنِ انشاء

سے مل آؤں۔ کئی دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ زندگی ادھوری لگتی ہے۔ اے لو، وہ ایک ہمدم دیرینہ آرہے ہیں۔ اماں کلیان خان، ذرا پیچوان تازہ کر لانا اور جو راغب شکیب اور پرویز بزمی اور انجم نیازی قریب ہوں تو ان کو سلام کہنا۔ یار زندہ صحبت باقی!

السلام علیکم۔ وعلیکم السلام۔ لو صاحب خط بند کر رہا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ سرکاری خط لایا۔ ابن انشاء پڑھ رہے ہیں اور اب کہہ رہے ہیں۔ مرزا ایک اور تماشا سنو۔ تمہیں مہر نیمروز ماہانہ چھاپنے کی اجازت مل گئی۔ اب تم بھی بصیغۂ ڈاک اپنی تصویر اور غزل بھیجو، بلکہ غزل بعد میں اور تصویر پہلے ــ!

نجات کا طالب
غالب خستہ جاں ناتواں ــــ

۴؍دسمبر ۱۹۷۸ء مطابق
۲؍محرم الحرام ۱۳۹۹ھ

۸

قرۃ العین میرزا اظہر جاوید سلمہ اللہ تعالیٰ!

خوبیِ دین و دنیا تم کو ارزانی، تمھارے خط کے دیکھنے سے آنکھیں روشن ہو گئیں، دل کو چین آ گیا، چشمِ بددور، خط اچھا، عبارت اچھی، اُردو میں مطلب نویس اچھے ہو، حق تعالیٰ تم کو عمر و دولت عطا کرے۔ لاہور شہرِ ناپرساں ہے۔ پر تم نے وہاں روشِ بندہ پروری باندازِ نو جاری کی ہے اور ایسے ایسے سخن دانوں کی قدر دانی کی ہے جو ز فرق تا بقدم دوامِ ابد کے حق دار تھے۔ لیکن اوچھی پونجی والے شہرت پسندوں نے ان کا حق چھینا، انھیں محرومِ زماں ٹھہرایا۔ تم نے قدر اور مرتبہ ان کا پہچانا، شہرتِ عام اور بقائے دوام کا تاج ان کے سر پر سجایا۔ حضرت دکتورِ زماں، ماہرِ علاج بالمثل، تبسم رضوانی تمھارا دوست اور میرے محسنِ دیرینہ شرقی بن شائق کا شاگردِ رشید ہے۔ گویا میرا رشتہ اِس عزیز سے دو واسطوں سے استوار ہوتا ہے۔ تم نے اس کے دیوان الموسوم بہ "کربِ نار" کی تقریبِ رونمائی کی۔ صدارت کے لیے سرگودھا کے رئیسِ کبیر، ادیبِ شہیر وزیر آغا کو بلایا۔ میرزا ادیب اور اصغر مہدی سے توصیف در مدحِ دیوان و صاحبِ دیوان لکھوائی۔ مجھے مقالہ بصورتِ تقریظ لکھنے کا حکم دیا۔ تو میں نے تعمیلِ ارشاد کی اور بہ تعجیل، بلا تاخیر، آپ کی یاد آوری کا ممنون

اور آپ کے دوامِ دولت و علم کا دُعاگو ہوں۔ اگر بوڑھا اور اپاہج نہ ہوتا تو ریل کی سواری ہیں مگر آپ تک پہنچتا۔ آپ کے تبسّم رضوانی کے اور میرزا ادیب کے دیدار سے مسرت اندوز ہوتا نہ پہنچنے کا سبب ضعف و نقاہت ہے۔ اگر میرے اوقات شبانہ روزی اور میرے حالات آپ دیکھیں تو تعجب کریں کہ یہ شخص جیتا کیونکر ہے۔ جو عنایت تم میرے حال پر کرتے ہو اور میرے رقعات، تقریظات، تنقیدات اخبارِ "امروز" اور مجلہ تخلیق میں چھاپتے ہو اور تقریباتِ ادب میں مجھے یاد فرماتے ہو۔ یہ صرف تمہاری خوبی ہے میں کس لائق ہوں۔

یہ بات تو میں نے آپ کو لکھی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اب تم نوکرِ سرکار ہو گئے ہو اور امورِ سرکار کے لیے دوپہر کا وقت رتن چند کی حویلی میں دفترِ امروز کے خس خانہ و برفاب میں گزارتے ہو۔ پر یہ امر ابن انشاء کی زبانی معلوم ہوا کہ ادارت عالم آشکار جریدہ "تخلیق" کی تم نے اصغر مہدی کی زوجہ محترمہ عذرا اصغر کو سونپ دی ہے۔ اے بھائی! یہ کیوں؟ رسالہ "تخلیق" تو تمہاری رگِ جان تھا۔ اسے منصب ہائے خطیر اور مدارجِ عظیم تک پہنچانے کے لیے تم نے جگر کاوی کی تھی —— فی الحقیقت اپنی جان سے کھیلے تھے۔ بات پیدا کی تھی۔ دوستوں کا حلقہ الگ، دشمنوں کا الگ بنایا۔ بے شک دولت ہاتھ نہ آئی۔ پر نیکنامی بمقدارِ کثیر جمع کی اور یہ سب اپنی مردمی و مردانگی سے۔ اب اس مسند پر تم نے عذرا اصغر کو بٹھایا۔ گویا برضا و رغبت اور بہ امن و امان مضبوط کرسی کو چھوڑنے کی روایت پیدا کی۔ یہ بات تمہارے ملک میں پہلی مرتبہ ظہور میں آئی۔ میاں! تم اس کے موجد ہو۔ پر خدا نہ کرے کہ تم اس کے خاتم بھی ہو۔ "تخلیق" سے تمہاری علیحدگی پر دل ملول ہے۔ پر تم نے جو روایت بنائی اس پر دل خوش ہوا۔ عذرا اصغر سے میرا سلام کہو، اسے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما، بر سبیل تعارف "سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی" کا ذکر کرو اور بتاؤ کہ جب تک وہ سر پر آرائے "مسندِ تخلیق" ہیں۔ میرے دل میں ان کی قدر ہزار چند اور نگہ میں ان کی عزت دس ہزار چند ہے۔ اگر ایک قصیدہ فی البدیہہ کہوں تو انھیں عذر تو نہیں ہوگا۔ ایک شعر ارتجالاً زبان پر آگیا ہے۔ عذرا اصغر کی نذر گزار دیجئے!

بِتُّد۔ زرُوئے رابطۂ حسن، ماہ تابِ جمال

بہ حسبِ ضابطۂ جاہ، آفتابِ ظہور

اسے سن کر جو کیفیت ان پر گزری ہو مجھے لکھو نیز پوچھ کر بتاؤ کہ میرے مکتوب کے باب میں رائے ان کی کیا ہے؟ اور جو وہ مجھے یہ سلسلہ جاری رکھنے کو کہیں تو مخاطب کون ہو اور موسوم کس سے کروں؟

اے میاں! جب سے میں اس عالم وجود میں آیا ہوں اور رسم و راہ محبت تم سے "اور تخلیق" سے استوار ہوئی ہے، میرے مخاطب تم ہو! میرا روئے سخن تخلیق کی طرف ہے۔ بنات النعش دہر سے بات چیت، لاگ لگاوٹ، ہنسی بذلہ بس دل لگی کی حد تک ہے کہ ذوق و خیال و شعر میں یہ معاون تخلیق ہے۔ اس سے آگے سامعہ، لامسہ اور باصرہ اجازت نہیں دیتا۔ یہ اقلیم جدید میں نے تمہارے لیے چھوڑ دی ہے، تم اس کے فرماں روا ہو۔ غالبِ خستہ جاں کو صرف اپنے حضور میں رہنے کی اجازت دو، اُردوئے معلّٰی میں اور عودِ ہندی میں تم نے میرے رقعات دیکھے ہیں۔ میرے مخاطب کون لوگ ہیں، علاؤالدین احمد خان علائی اور منشی ہرگوپال تفتہ اور میرزا یوسف علی خاں عزیز اور میرزا حاتم علی بیگ مہر اور شیو نرائن آرام، منشی نبی بخش حقیر، میر مہدی مجرُوح، نواب کلب علی خاں بہادر۔ ان میں سے کوئی عورت ہے؟ سو تم بھی مجھے کہو کہ تخاطب بانداز سابق برقرار رکھو۔ یہ میں تم سے نہیں کہہ رہا بلکہ میرزا اظہر جاوید اپنے ممدوح اسداللہ خاں غالب سے کہتا ہے اور میں تعمیل ارشاد میں بندگی کرتا ہوں، کورنش بجالاتا ہوں۔

ایک داستان جو عذرا اصغر مدیرہ "تخلیق" کی تصنیف شمار ہوتی ہے کی شہرت بزبانی سید وقار عظیم مجھ تک پہنچی، چھوٹی چھوٹی داستانوں کے مجموعے پر سنا ہے کہ میرے ایک محبِّ مکرم و محترم نے بصد تامّل تقریظ لکھی۔ شہرت اس کتاب کی بھی مجھ تک پہنچی۔ میں دونوں کو دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں اور جو تم ان کی تقریب رونمائی کرو تو مجھے بھی مقالہ لکھنے اور دانشوران لاہور کے سامنے پڑھنے کا موقع دو۔ ہر چند کہ داستان اور افسانہ اور کہانی میرا موضوع نہیں، پر باقر علی داستان گو، ناصر نذیر فراق دہلوی، فقیر محمد گویا، سیّد وقار عظیم اور محمد احسن فاروقی نے جو مجالس یہاں خلد آباد میں منعقد کیں اور مجھے بالالتزام شامل کیا۔ ان سے اس فن میں میری سوجھ بوجھ کو جلا ملی ہے۔ اب میں قرۃ العین حیدر اور جمیلہ ہاشمی اور عذرا اصغر کے فن کے باب میں اظہار تمیزی پر قادر ہوں اور بطریق موازنہ ان پر گفت گوئے طویل بہ انداز لطیف قلم بند کرا تا ہوں۔ تم سنو گے تو داد دو گے کہ بوڑھے غالب نے ویران خرابوں کو آباد کیا۔ نئی قلمرو میں قدم رکھا۔

پرسوں اور کل دو ملاقاتیں سید مسعود حسن رضوی ادیب سے ہوئیں، غریب خانہ پر تشریف لائے تھے۔ کیا کہوں کہ مجھ پر بے سابقۂ معرفت کیا عنایت فرمائی۔ لکھنؤ سے ایک نامہ ان کے پاس دکتورِ ادب نیّر مسعود کا آیا تھا کہ پاکستان کے ایک صاحبزادے سید صاحب کے اجالاً پی ایچ ڈی کرنے والے ہیں۔ اور اب لکھنؤ میں کمندیں پھینک رہے ہیں۔ میں پہلے ہنسا اور پھر رو دیا، تم پوچھو گے بھلا کیوں ہنسا؟ اے بھائی! سینکڑوں نابالغانِ ادب میرے ریزے چنتے چنتے شہرت آور ہوگئے۔ پر عالم یہ کہ ممدوح غائب اور مدّاح سر بر آرائے سلطنتِ ادب ہے۔ اس لیے میں بے اختیار ہنس پڑا اور رویا اس لیے کہ اب یہ واقعہ سید مسعود حسن رضوی ادیب پر وارد ہونیوالا ہے۔ حبیب لبیب میرزا حاتم علی بیگ مہر نے میرے دل کی بات یوں کہی ہے۔

اس عہد میں ہر اک تہہِ چرخِ کہن لُٹا
اوروں کا زر لٹا، مرا نقدِ سخن لُٹا

عرض پرداز ہوں کہ اس دور میں مدّاح ناشائستہ صد ہزار آفرین اور ممدوحِ شائستہ سزاوارِ صد آفرین ہے۔ رضوی صاحب موصوف اس گزارشِ احوال واقعی پر فکر مند ہوگئے، پر بات کو پا گئے، بولے:

"میرزا، دور کی کوڑی لائے ہو۔ پر حاتم علی بیگ کا شعر مجھ پر کم، وزیر آغا پر زیادہ صادق آتا ہے
اوروں کا زر لٹا، مرا نقدِ سخن لٹا، واہ وا۔"

میں اس کیفیت کو اب یہاں پر ہی سمیٹتا ہوں اور تم سے دریافت کرتا ہوں۔ "اس ماہ کا "اُردو زبان" تم نے دیکھا"؟ اور وہ مضمون پڑھا" جو نہ کہنے کی باتیں" کے زیرِ عنوان طبع ہوا ہے۔ یہ مضمون بوجوہ میں نے سید مسعود حسن رضوی ادیب کو نہیں دکھایا اور پرچہ "اُردو زبان" ایسی جگہ رکھ دیا ہے جہاں ان کی نظر نہ پڑے، تاکہ شنوائی اور دلیلِ آشنائی میں فاصلہ قائم رہے۔ ناحق سید صاحب کا اپنے مدّاح کے باب میں دل میلا نہ ہو۔ انور سدید نے ناحق "چہ دلاور است دزدے......" کا مضمون باندھا، اے بھائی کچھ لوگ نقدِ سخن لٹاتے ہیں۔ بھلا اس سے پوچھو، تم لوٹنے والوں کے آڑے کیوں آتے ہو اور مقراضِ تیز سے محبت کو کیوں قطع کرتے ہو؟ ایک شکوہ اس باب میں شہر کراچی سے فرمان فتح پوری نے کیا کہ ایک مہ جبیں الموسوم شگفتہ نسرین نے ان کی کتاب "اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" کا مقدمہ لفظاً لفظاً "قومی زبان" کے شمارہ ستمبر ۱۹۷۸ء

میں اپنے نام سے چھپوا دیا۔ میں نے اُن کا شکوہ سُنا۔ لیکن مشورہ دیا کہ یہ حکایت انور سدید کو نہ سنانا کہ وہ اس باب میں ایک مضمون اور باندھے گا۔ تم سے کیوں چھپاؤں، مجھے تو فرمان فتحپوری پر رشک آرہا ہے۔ یہ حور شمائل میرا شمیم دیوان اپنے نام کر لیتی تو اُف نہ کرتا۔ انور سدید کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتا۔ لیکن یہ نہ تھی ہماری قسمت ......

سنا ہے کہ عبدالرشید تبسم عارضۂ قلب میں مبتلا ہے۔ یزدانی جالندھری کو اس مرض نے نڈھال کر رکھا ہے۔ ہائے ہائے، بے چارہ بذل حق محمود آن کی آن میں ناگاہ اس بیماری کے آگے دم توڑ گیا۔ اے بھائی! تمھارے وطن میں ادیبوں کے دل اتنے کمزور کیوں ہو گئے؟ کیا آلام کی یورش زیادہ ہو گئی ہے۔ کیا آفاتِ ارضی و سماوی بڑھ گئے ہیں؟ کیا فلک ناہنجار کج روی پر اُتر آیا ہے؟ بھلا بتاؤ کہ سلیم اختر جیسے ناتواں کو یہ روگ کیوں؟ —— غلام الثقلین نقوی نے مجھے اس کا حال لکھا، کلیجہ منہ کو آ گیا۔ خدا کا شکر بجا لایا کہ میرزا منوّر، اور ڈاکٹر وزیر آغا موجود تھے۔ طبّی امداد بروقت مہیا ہوئی اور کیفیت اضمحلال کی رفع ہوئی۔ اے بھائی سلیم اختر تو ماہر نفسیات ہے۔ مداریوں، نٹوں اور شعبدہ بازوں کو جلو میں لے کر ڈگڈگی کی آواز سنتا ہے اور اس کا نفسیاتی تجزیہ کرتا ہے۔ بے ڈھنگی عورتوں پر افسانے لکھتا ہے۔ گویا سب کے منہ کالے کرتا ہے ایک دفعہ اس نے بکیر کلام سے نرگسیت دریافت کی اور میں پہروں آئینے میں اپنی صورت دیکھتا رہا۔ ایسے آدمی کا تشنج دورانِ تحریر رفع ہو جاتا ہے۔ اسے عارضۂ قلب نہیں ہو سکتا۔ تم اسے حکیم نشتر واسطی کے پاس لے جاؤ۔ آفتاب قرشی سے مشورہ کرو۔ اور اجازت دو تو یہاں سے کویراج ہر نام داس کو رقعہ لکھ بھیجوں۔ مجھے تو کوئی اور فساد معلوم ہوتا ہے اور جو یہ نہ ہوتا تو خلاصہ تاریخ اُردو میں اُس دبستان سے روگردانی کیوں کرتا جس کا زائیدہ ہے۔ تم نے اس کی "صورتِ احوال" پڑھی ہے؟ مجھے تو فسادِ ریاح معلوم ہوتا ہے۔ نہیں تو یہ سب اندر کی ٹوٹ پھوٹ کا نتیجہ ہے۔

اور ہاں سنا ہے کہ رائٹرز گلڈ نے اشرفیاں لٹا کر کوئلوں پر مہر لگا دی ہے۔ مہر زدہ لوگوں میں انور سدید کو بھی شامل کیا ہے۔ اے بھائی! یہ انور سدید کیوں کر اس صف میں آ گیا؟ اس کے حق میں کس نے ڈنڈی ماری ہے؟ میرزا ادیب سے حدیثِ خلوت دریافت

کرو اور مجھے لکھو!

اے بھائی! سراج منیر کو اس بڑھاپے میں شادی کروانے کی کیا سوجھی؟ کیا ادب سے چھٹی کرنے کا ارادہ ہے۔ میاں کتاب اور بیوی ایک گھر میں نہیں رہ سکتیں، سراج منیر اپنی بیوی کی سوکن کو کہاں رکھے گا؟ امجد اسلام امجد نے واپس ایم اے او کالج جانے کی کیوں ٹھانی ہے۔ اب اس کی مسند پر کس دوست نے تاک لگا رکھی ہے؟ سلیم احمد کو مشاورتِ سرکار سے کتنا فائدہ پہنچا ہے۔ وزیر آغا اور سجاد نقوی کس حال میں ہیں؟ ایک نامہ فیصل آباد سے انور محمود کا آیا۔ لکھا ہے کہ ریاض مجید نے اُردو نعت نگاری پر مقالہ شروع کر دیا ہے۔ اور اب نشست اس عزیز کی محفل ہوٹل میں نہیں ہوتی۔ کیا بات سچ ہے؟ واللہ مجھے سچ معلوم نہیں ہوئی! "اُردو زبان" کا احوال کیا ہے؟

مطالب اور مقاصد تمام ہوتے اور ہم تم بزبانِ قلم باہم دگر ہم کلام ہوئے، زیادہ کیا لکھوں۔ "مہرِ نیمروز" کے لیے اپنی غزل اور عذرا اصغر کا افسانہ بھجواؤ، ذوالفقار احمد تابش، مستنصر حسین تارڑ، مسعود اشعر، یوسف کامران، نجیب احمد، نسیم درّانی، راغب شکیب، کشور ناہید اور وزیر آغا کو میرا اسلام کہو، اے لو، سامنے پروفیسر وزیر الحسن عابدی تشریف لا رہے ہیں۔ اے آمدنت..... اب حضرت عابدی سے محوِ کلام ہوں۔ ظہوری ہمارے درمیان موجود ہے۔ آپ سے جواب کا طالب ہوں۔

جمعۃ المبارک ناوکِ بیداد کا ہدف

۲۴ شعبان المعظم ۱۳۹۹ھ غالبِ خستہ جاں

مطابق۔ ۲ جولائی ۱۹۷۹ء

۹

جانا، عالی شانا!

آداب، کورنش، شکریہ، تم پوچھو گے کیوں، میں عرض پرداز ہوں گا۔ تمہارا مجلّہ "تخلیق" پہنچا۔ میں نے پڑھوایا، خط اٹھایا، محسوس ہوا، جیسے تم خود آئے ہو۔ جلو میں تمہارے مدیرہ "تخلیق" عذرا اصغر ہے، روبرو میرے بہ از پہلو بیٹھے ہو، میں نے تمہارا حال پوچھا ہے، تم نے میری مزاج پرسی کی ہے۔ مدیرہ رئیسہ عذرا اصغر کے باب میں جو میں نے اپنے سابقہ مکتوب میں لکھا تھا۔ اس کا احوال سن کر جی خوش ہوا۔ اسے لو، عذرا اصغر زیرِ لب مسکرا رہی ہے۔ گویا تمہارے ارشاد پر مہرِ تصدیق لگا رہی ہے۔ میاں سنو! میں نے ایک تصویر عذرا اصغر کی اپنے دل میں بنا رکھی تھی۔ اس کا عکس ہو بہو سامنے دیکھا۔ واللہ سرِ مو فرق نہیں۔ قد، رنگ، شکل، شمائل میں بعینہٖ قرۃ العین طاہرہ۔ عمر کا فرق اور کچھ کچھ متفاوت، خلیق، شفیق، کریم، حلیم بصیغۂ تانیث، شعر فہم، داستان شناس، قیاس ہے کہ سینکڑوں شعر اصغر مہدی کے اور غالب کے اور میرزا اظہر جاوید کے زبانی یاد ہوں گے۔ نثر لکھتی ہے اور خوب لکھتی ہے۔ جلالائے عصمت چغتائی کی طرزِ مستعملِ دیرینہ

شگفتہ جبیں ایسی کہ اس عفیفہ کا تصوّر کرنے سے غم کوسوں دور بھاگ جائیں۔ مکارمِ اخلاق وہ رُوح افزا کہ جس سے مُردہ زندہ ہو جائے۔ اَللّٰھُمَّ دَامَ اِقْبَالَہٗ وَزَادَ جَلَالَہٗ۔ تم نے دوربینِ انگلسیہ سے پری جمالوں کی تصویریں کھینچی ہیں۔ پر یہ تصویر جو میں نے خامۂ خیال سے بنائی ہے۔ دیکھو اور بتاؤ کہ مدیرۂ تخلیق کی مثال ہے کہ نہیں، دنیا میں جو شخص بھی پاکیزہ ذوق کا دعوٰے رکھتا ہے اور "تخلیق" کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ عذرا اصغر کے خدوخال کو اسی طرح تراشے گا اور جو اس میں اور عذرا اصغر میں سرِ موفرق ہو تو فقیر غالب علی شاہ گردن زدنی، ہر چند یہ آدابِ عالیہ اور رسومِ زمانہ کے خلاف ہے لیکن آئمنۂ مجلّہ "تخلیق" میں تصویر اس کی چھاپو، اہلِ ذوق و ادب غالب کی فوٹو گرافی کا مشاہدہ اور تصوّر کا حقیقت سے موازنہ کریں۔

میاں، یہ لاہور میں کیا فساد نمودار ہے۔ ماہرِ موسیقی رشید ملک ادب کے درپئے آزار ہے۔ عرصہ پندرہ سال کا ہوتا ہے کہ دکتورِ ادب وزیر آغا نے ایک کتاب مسمہ بہ "اردو شاعری کا مزاج" مؤلف کی تھی۔ شہرت اس کتاب کی دور دور پہنچی، ارباب علم و نقد نے اس پر مضامین ہائے کثیر باندھے، جو کم نظر اور کوتاہ عقل تھے۔ انھوں نے قطعے اس کتاب کے حاصل کیے اور اپنے نام سے چھپوائے، میرے پاس ذکر اس کا حمید احمد خاں نے اور مولانا صلاح الدین احمد نے کیا۔ نسخہ مطبوعہ منگوایا اور نواب زین العابدین عارف سے پڑھوا کر سنا۔ کاوش ان کی کو سراہا۔ ایک ایک لفظ کو چوما، ایک ایک سطر کی داد دی، واللہ ایسی تحقیق پہلے نہیں ہوئی، تمھارا ممدوح اسد اللہ خاں غالب کہ صاحبِ سیف و قلم ہے۔ ہزار کوشش کرے۔ ایسی کتاب مرتب نہیں کر سکتا، بینائی میری کمزور ہے۔ پر میں نے بگوشِ ہوش سنا، ذکر میرا اس کتاب میں باندازِ دگر موجود ہے، ہر چند اب پیمانہ ہائے تنقید تبدیل ہو گئے ہیں اور مقالاتِ نقد سے تقریظ و تحسین کا عنصر خارج ہو گیا ہے۔ پر اعلیٰ حضرت! جو کچھ میں نے سنا اس سے محظوظ ہوا۔ وزیر آغا کی خدمت میں کورنش بجا لایا۔ واللہ اس نے میرا، میر تقی میر کا، خواجہ میر درد کا اور مومن خاں مومن کا ذکر زمانے کے سیاق و سباق اور تہذیب و ثقافتِ دہلی مرحوم

کے پس منظر میں کیا اور خوب کیا۔ ان شعرائے قدیم کو سلکِ ادبائے جدید میں شامل کیا
میرے معاصرین کو قدما کو اور خود مجھے حیاتِ جاوید عطا کی۔ واہ وا۔

سنا ہے کہ رشید ملک نے اس کتاب کی توہین اور مسودہ کی تفضیح میں ایک
نسخہ طویل لکھ کر رسالہ "فنون" کو بھیجا، نہ چھپا۔ پھر ایک اور مقامی رسالہ نوطلوع کو آمادۂ اشاعت
کیا اور مسودہ بزور سفارش اور بصرفِ کثیر چھپوایا۔ ایما اس میں کئی پردہ نشینوں کا تھا۔
مدیر جریدہ مذکور میرا ہمدمِ دیرینہ ہے۔ عرصے سے متلاشی نام و مقام ہے۔ ان کی آمدِ دہلی
پر میں نے ایک خوانِ شعرا سجایا۔ جملہ خاطر تواضع کی۔ ذکر ان کا اُردو اخبار دہلی میں جلی
حروف میں کیا۔ سنا ہے کہ یہ سب کچھ ان کی توقع سے کم نکلا۔ لہٰذا گلہ کیا اور مجھے پرچہ
اعزازی بدستورِ قدیم ارسال نہیں کیا۔ اے بھائی، یہ رسالہ تا حال میری نظر سے نہیں
گزرا۔ میری سماعت و بصارت اس کی متلاشی ہے۔ سنا ہے کہ وزن اس کا گراں تر ہے۔
تقسیم عام میں مفت ہاتھ نہ آئے اور تم خریدنے کی سکت رکھتے ہو اور مجھے بھیجو تو قبل از
ترسیل شکریہ، صد ہزار شکریہ!

مقصود صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ موصوف نے کیا بات نئی نکالی ہے اور جو ڈاکٹر
سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، شمیم احمد، عارف عبدالمتین اور بلراج کومل وغیرہم
نے اختلاف بوسیلۂ نظر کیا تھا کیا یہ اس سے الگ ہے یا محض اعادہ و تکرار ہے۔ تم اخوان الصفا
میں سے ہو۔ بتاؤ کہ سید سجاد نقوی نے اس کتاب کی آرائے تائید و تردید پر جو نسخہ موسوم بہ
"معاصرین کی نظر میں" مرتب کیا تھا وہ ملک صاحب موصوف کی نظر سے گزرا ہے اور کیا
یہ ممکن ہے کہ سجّاد نقوی ایک رسالہ در تردید آں نہ لکھیں، یقین بالیقین کہ لکھیں گے،
شہرت رشید ملک کی اکنافِ پاکستان اور اکنافِ ہندوستان میں پھیلے گی، علاوہ ماہرینِ
موسیقی کے ذکر ان کا ماہرینِ ادب کے ساتھ ہوگا، اس کتاب کے وسیلے سے نام ان کا
دور تک دور تک پہنچے گا۔ یہی مقصود ہے ان کا، سو یہ ضرور پورا ہوگا۔

تم پوچھو گے میرزا، یہ ایقان تمھیں کیوں کر ہوا؟ سنو سخن فروشانِ کلکتہ نے کھتری
قتیل کو میرے مقابل لا کھڑا کیا، میں نے معذرت کے طور پر "مثنوی بادِ مخالف" لکھی،

عرض پرداز ہوا کہ فقیر تنقید کو بُرا نہیں مانتا، مگر فنِ نقد کو سوائے میرے کون جانتا ہے۔ تنقید کی خوبی یہ ہے کہ حق بات کہے اور راہِ راست سے منہ نہ موڑے اور معنداً دوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش سے آمادۂ شر نہ ہو، جیسے کہ انور سدید ہوتا ہے اور ہر موسم برسات کے ساتھ اپنے کہے سے نہ پھرے جیسے کہ سلیم اختر پھرتا ہے۔ محمد حسین تبریزی نے "بُرہانِ قاطع" لکھی۔ میں نے "قاطع برہان" مرتب کی، تنقید کو دلیل سے پیش کیا۔ وہ جو ایک شخص مجہول الحال نے اہلِ دہلی سے میرے کلام کی تردید میں کتاب تصنیف کی ہے۔ مسمّٰی بہ "محرک قاطعِ برہان" اس کی تردید میں ایک طالب علم مسمّٰی بہ عبدالکریم نے سعادت علی مؤلف "محرک قاطع برہان" سے سوالات کئے ہیں۔ اور ایک محضر مرتب کیا ہے۔ ایک دوست نے بصرفِ زر اس کو چھپوایا۔ ایک ایک نسخہ اہل دہلی اور ادبائے لکھنؤ کو مرسل کروایا۔ میں نے اس تمام بحث کو مکرّر "درفشِ کاویانی" میں جمع کیا گویا ان سب اشخاصِ مجہول الحال کو حیاتِ جاوید کا مژدہ سنایا۔ تم میرے بھائی ہو، مولانا علائی ہو، کہو! کیا یہ لوگ اب تک غالب علیہ الرّحمہ کی نکتہ چینی بے جا کی بدولت زندہ نہیں ہیں اور مولانا غلام رسول مہر، اور مختار الدین آرزو اور حمید احمد خاں اور پنڈت مالک رام اور محمد حیات خاں سیال نے جہاں غالب کا نام لیا ہے، وہاں کھتری قتیل کا نام بھی نہیں لیا۔ سو بھائی! اگر ایک ماہر موسیقی آمادۂ ناسپاسی ہو تو باور کرو کہ وہ ایسا بہ اقتضائے شہرت کرتا ہے۔ ورنہ جس تصنیف کبیر پر رائے فراق گورکھپوری اور خلیل الرحمٰن اعظمی اور سیّد احتشام حسین اور فرمان فتحپوری اور سہیل بخاری اور جعفر طاہر اور رفیق خاور اور اسلم فرخی اور نظیر صدیقی اور ریاض احمد اور سلیم اختر نے دی ہو وہ مزید محتاج نقد ہے؟

بارے زبان پر پروفیسر سلیم اختر کا نام آیا۔ خدا کی بندہ نوازیاں ہیں کہ مجھ ننگِ آفرینش کو بھی ان سے بھلا کہلوایا اور تا حال وہ اپنے فرمودہ پر بہ اثبات رائے قائم ہے۔ ظاہرا یہ میرے مقدر میں کوئی سعادتِ عظمیٰ نہ تھی۔ کہ سلیم اختر نے میرے کلام کو سراہا۔ اس پر تنقید لکھی، نرگسیت کا پہلو نکالا۔ میرا حقِ ادب ادا کیا۔

لیکن یہ سب فسادِ ایام سے پہلے کی باتیں ہیں۔ سنا ہے کہ اب اس کے مقاصد کی ذیل بدل گئی ہے۔ اور سابقہ تحریروں میں ترمیم کر رہا ہے۔ ادب کو بنیئے کے ترازو میں ڈالتا ہے حسبِ ضرورت و مرضی ایک پلڑے کو اونچا پھر اسی کو نیچا دکھاتا ہے۔ گیا تم نے میرے کہے پر عمل کیا؟ اسے لے کر حکیم نیّر واسطی کے پاس گئے، آفتاب احمد قرشی سے مشورہ کیا، کویراج ہرنام داس کو میرا سربمہر لفافہ برائے سفارش و معائنہ نفسی پروفیسر سلیم اختر پیش کیا؟ اے بھائی! میں مشوّش ہوں، متردّد ہوں۔ ستار طاہر نے اس پر نا انصافی کا اور عجلت پسندی کا الزام لگایا ہے۔ سنا ہے کہ انور سدید نے بھی ایک مضمون در تردید سلیم اختر لکھا اور تمہیں اشاعت کے لیے بھیجا۔ انور سدید کی حق گوئی کا سلیم اختر معترف ہے۔ کتاب 'اختلافات' کے سرورق پر موصوف کی قیمتی رائے درج ہے۔ اقتضائے حالات کے مطابق اور بعد تکمیل مقاصد اس رائے میں تبدیلی واقع ہوئی ہو تو مجھے لکھو، انور سدید نے روئے سخن طاہر تونسوی کی طرف کیا تھا اور الزام سرقہ مثبوت شہادت واضح کیا، سلیم اختر اس کا اُستاد ہے، کیا برہم تو نہیں ہوا۔ اور انور سدید کی حق گوئی کا مخالف ہوا کہ نہیں؟ اگر نہیں ہوا تو کیوں؟

اے بھائی! پاکستان میں سرقہ کا مرض عام ہے، لوگ اب تک میرے کلام سے ریزہ چینی کرتے ہیں۔ طاہر تونسوی کس شمار میں؟ کس قطار میں؟ ہاں طاہر تونسوی کے سرقہ بالارادہ کو جو سلیم اختر مبنی بر سہو شمار کرتا تو ضرور اصلاحِ احوال کا موقعہ پیدا ہوتا، تاج سعید اسی پر عدم تکمیل کا طعنہ وارد نہ کرتا۔ سنا ہے کہ اب سلیم اختر بھی ناقدینِ ادب کے برعکس ماہرینِ موسیقی کے ارشاداتِ کاذبہ سے اتفاق کرتا ہے۔ گویا اپنے سابقہ فرمودات سے روگردانی کرتا ہے۔ اے بھائی! مجھے تو یہ سب اندر کی ٹوٹ پھوٹ نظر آتی ہے۔ کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟

بھلا دیکھ کر بتاؤ بہزادِ وقت محمد حنیف رامے کس حال میں ہے۔ حبیب لبیب احسان دانش کی طبیعت اب کیسی ہے؟

ایک عنایت نامہ راغب شکیب کا پہنچا۔ معلوم ہوا کہ انور سدید نے سرگودہا اور

سیّد وزیر حسین شیرازی نے دنیا سے مُنہ موڑ لیا۔ ہائے ہائے، سرگودھا۔ ویران ہوگیا۔ سنا ہے کہ انور سدید بکنار سندھ ایک مقام بہ موسوم کوٹ آدو فروکش ہے۔ یار و اغیار سے دور ہے۔ دولتِ تنہائی سے معمور ہے۔ بروایت منصور قیصر اس زمین شور میں انشائیہ کی کونپل اگا رہا ہے۔ اسے لو، ہرکارہ آیا ریاض مجید کا نامہ فیصل آباد سے لایا۔ اسے آمدنت باعثِ خوشنودی ما، لکھا ہے کہ اُردو نعت نگاری پر ابتدائے تسوید مقالہ کی خبر کسی دشمن نے اڑائی تھی! اسے بھائی! وہ خبر تو میری ساختہ تھی، گویا وہ دشمن خود غالب تھا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ حضرت تو انور محمود خالد اور احسن زیدی کی مقالہ آرائی میں بھی مانع ہے۔ اور رشید امجد اور مشتاق قمر راولپنڈی میں اس کی تقلید پر آمادہ ہیں ــ ہاں پروفیسر ریاض احمد ریاض اور رشید گریجہ کو مسلسل انگیخت کر رہا ہے۔ اگلے روز یہ بات ابن انشا اور یوسف ظفر کو بتائی کہ اصحاب مذکورہ صدر تھائے فن پر اور شخصیت پر اور ادب پر مقالے تسوید کرنیوالے ہیں۔ دونوں اصحاب حیرت زدہ ہوئے ــ!

پاکستان میں ایک مقام دور افتادہ ہے۔ اسم گرامی اس کا خان پور ہے۔ اس شہر پر گذشتہ برس ایک آفت طوفانِ باد و باراں نے ڈھا دی تھی۔ وہاں میرا ایک جلیسِ سخن حیدر قریشی رہتا ہے۔ اگر آفت سماوی سے محفوظ ہو تو اس کا حال دریافت کر کے لکھو، ایک پرچہ الموسوم بہ "جدید ادب" اس نے چھاپا تھا۔ تمہارا ہم مزاج، ہم کار اور ہم مشرب نظر آیا کہ شاعرات کو بخط جلی چھاپتا ہے۔ اخبار امروز میں لکھا تھا کہ اس نے ایک مشاعرہ شاعرات کا مرتب کیا۔ صدارت اس کی وزیر آغا سے کرائی۔ موصوف تمام عرصہ گردن جھکائے بیٹھے رہے۔ گویا قیامت کے سامنے رہے۔ اسے میاں حیدر قریشی تم اس مشاعرے میں غالب کو مدعو کرتے۔ حبیب لبیب اظہر جاوید کو بلاتے، پھر مشاعرے کی بہار دیکھتے۔ سنا ہے کہ "جدید ادب" کی ہیئت اور معنویت میں اب تبدیلی آگئی ہے۔ مجھے اس کی تفصیل لکھو، اور بہ تعجیل ــ بھائی یہ فرحت نواز کون ہے۔ غزل اس کی مرغوب خاطر ہے۔ "تخلیق" میں اصغر مہدی کا یہ شعر مجھ کو مزا دیتا ہے۔

میں گنہگار ہوں، انساں ہوں پیمبر نہیں — ہاں ستم خوردہ ہوں اپنوں کا ستم گر تو نہیں

میں نے یہ بات یوں کہی تھی :-

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے — آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

بلاشبہ اصغر مہدی نے مضمون الگ نکالا - اور انداز جداگانہ اختیار کیا - دل خوش ہوا - واہ وا - یہ میں نے نہیں کہا تھا کہ تم مجھے اپنے کلام سے محروم رکھو - جو غزل، نظم، کالم، افسانہ لکھو - نہ مسودہ بلکہ نقل اس کی مطبوعہ ضرور بھیجا کرو -

رفیع الدین ہاشمی صاحب کو معلوم ہو کہ "جواہر منظوم" میری تصنیف نہیں - ایک صاحب منشی غلام مولا انگریزی سرکار کے ملازم تھے - وہ انگریزی نظموں کو اُردو میں تبدیل کرتے، میں انھیں نظم کا جامہ پہناتا - میری حیاتِ مہکار میں یہ کتاب تین بار چھپی، ہر دفعہ نظر ثانی کے ساتھ، لاہور میں نقل اس انداز کی امجد اسلام امجد نے اڑائی اور محمد کاظم کے عربی ترجمے کو اُردو نظم میں پیش کیا - واللہ میں "جواہر منظوم" کو اپنے نامہ ہائے سخن میں درج نہیں کرتا - ایک مشقت تھی جو میں نے اٹھائی - البتہ معاوضہ اس کا کثیر پایا - اللہ اللہ خیر صلا -

اس خط کا جواب جتنی جلد ہی عنایت کیجئے گا، مجھ کو جلا لیجئے گا - جناب پرویز بزمی صاحب آلودۂ سیاست ہیں جو انھیں فرصتِ سماعت ہو تو میرا اسلامِ نیاز پہنچانے میں توقف نہ ہو اور جو وزیر آغا سے ملاقات ہو تو ایک کریٹ مالٹے کا رس دار بھجواؤ

تم سلامت رہو قیامت تک -

۲۶ر صفر ۱۴۰۰ھ بمطابق
۱۵ر جنوری ۱۹۸۰ بروز سہ شنبہ -

اپنی مرگ کا طالب
غالب علی شاہ

۱۰

صاحب!

عجب تماشا ہے، تمھارے کہنے سے میں نے عذرا اصغر کو خط لکھا۔ وہ اوصاف گنوائے جو اوصافِ حسنہ کہلاتے ہیں اور عذرا اصغر میں موجود ہیں۔ اظہار ان کا تعریفِ بے جا میں نہیں، بلکہ احوالِ حقیقی میں آتا ہے۔ مزید توضیحِ صداقت کے لیے عرض پرداز ہوں کہ تصویر موصوفہ کی اپنے مقبولِ زمانہ رسالہ "تخلیق" میں چھاپو۔ تم نے عرِ لفیۂ غالب نظر انداز کیا۔ پر تصویر باندازِ دگر چھاپ دی۔ ایک تصویر میں نے تارِ نگاہ سے کھینچی اور تمھارے قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کی۔ دوسری کیمرہ انگلسیہ نے بنائی اور تم نے چھاپی، ان دونوں میں حدِ تفاوت کہاں ہے۔ اے بھائی! میں یہ بات ایسے نہیں کہتا، آنکھوں دیکھی بیان کرتا ہوں۔

کل پہر گئے ڈاک سے مجھے داستانوں کا ایک مجموعہ شنگرفی گرد پوش میں ملفوف ملا۔ مجھ کم بصر کے لیے یہ کحلِ جواہر ہے۔ میں نے اِن بوڑھی آنکھوں سے دیکھا کہ منظر اس پر خزاں کا مصوّر ہے۔ سامنے ایک شاخ تنہا کہ برگ و بار سے محروم ہے ایستادہ

ہے، ہاں ایک پتّہ ہوا کی زد پر ہے۔ عنوان بھی بہ خط روشن پڑھا "پت جھڑ کا آخری پتّہ"۔ یہ تصنیف لطیف عذرا اصغر کی ہے۔ لیکن اے بھائی، میں نے سرورق بعد میں دیکھا۔ کتاب کی پشت پر ناگاہ نظر پہلے پڑی، دیکھا کہ ایک پری جمال عینک کے دبیز شیشوں سے محوِ تماشا آرائی ہے۔ بظاہر نظر افق پر اٹکی ہوئی ہے لیکن دنیا کے تمام مناظر بنات النّعش گردوں کی طرح اس کے سامنے عریاں ہیں۔ ہر چند بینائی میری کمزور ہے، پر میں نے پہچان لیا کہ یہ صورت دیکھی ہوئی ہے اور ہو نہ ہو یہ تصویر اس عفیفہ کی ہے جو میرزا غالب کی اور اس کے خطوط کی قدر دان ہے اور اسے بحروفِ جلی اپنے مؤقّر جریدہ تخلیق میں چھاپتی ہے۔ گویا مجھ کو دوبارہ جلاتی ہے، مجھ پر احسان کرتی ہے، اب میں جو اس کی تعریف میں چند جملے بہ اضطرار قلب رقم کرتا ہوں تو کیا یہ جھوٹی کاسہ لیسی ہے، اور لوگ معترض ہوئے ہیں تو کیوں؟ وہ جو بساطِ دل میں یک قطرۂ خوں دل تھا وہ جوشِ انبساط سے معمور ہو تو اس کا اظہار بھی نہ کرے، احسان شناسی کا ثبوت نہ دے۔ پھر یہ برّشِ تیغِ جفا سے ناز فرمائی کیوں؟

اے بھائی! تم نے اس شاخسانے کے باطن میں جھانکا، کچھ ٹوہ لگائی، مجھ سے سنو، تمام اہلِ پاکستان مئے شہرت کی خواہش میرزا غالب سے اور میرزا اظہر جاوید سے اور عذرا اصغر سے "اوراق تخلیق" سے کرتے ہیں۔ انھیں اس سے غرض نہیں کہ عذرا اصغر نے اور تم نے اور غالب نے ادب کے میدان میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے ان کی نوعیت کیا ہے، مرتبہ کیا ہے۔ انھیں دُکھ اس بات کا ہے کہ ذکرِ خود ان کا اس انداز میں کیوں نہیں، اور یہ خط ان کے نام کیوں مرقوم نہیں۔ میں نے اس قسم کے لوگوں سے سخن کیا ہے پر قدرے آزردہ لبی سے اور یوں کہ

"تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے"

سو بھائی! تم بھی ان کو خاطر میں نہ لاؤ، یہ تمھیں ہستی کے فریب میں لاتے ہیں، "تم عالم تمام حلقۂ دامِ خیال رکھو"۔

مجھے کتاب عذرا اصغر کی مجلّہ "تخلیق" کے ہمراہ ملفوف ملی، اسے میرا سہو سمجھو کہ

رسید نہ بھیج سکا۔ مکرر یہ کہ بینائی میں فتور ہے۔ نواب زین العابدین عارف پاس نہیں کہ وہ پڑھتا اور میں گوشِ ہوش سے سنتا۔ اسے میرا عجز کہو، میری بے زبانی سمجھو۔ کہ بغیر مطالعہ کے قلم کاغذ پہ رواں نہیں ہوتا اور وہ جو تقریظاتِ جلی کا رواج چل نکلا ہے کہ ہرا ایرا غیرا نتھو خیرا کتاب کے سرورق کے لیے بے محل و بے جواز رائے مطلاّ حاصل کرنے کے درپے ہے تو میں اس کا سخت مخالف ہوں اور دیکھ لو آج تک کسی دوست کے سرورق کو اپنے قلم سے آلودۂ تعریف نہیں کیا۔ ہاں تنقید کی بات الگ ہے اور اس کے لیے میں اپنا حق محفوظ رکھتا ہوں، جو لوگ اس تعریف بے جا کے خواہاں ہیں انہیں راہ ایسے آستانوں کی دکھاتا ہوں جہاں رائے مشین سے ڈھل کر نکلتی ہے۔ بس ادھر سے حکم صادر ہوا اُدھر کان سے قلم اٹھایا اور کھٹ سے فلیپ حاضر! اور جو کہو کہ حضرت یہ رائے تو سالِ گزشتہ آپ نے خاقانیِ ہند محمد ابراہیم ذوق کے دیوان پر عطا کی تھی اب یہی الفاظ غالبِ خستہ کے غریب و غیور دیوان پر کیوں چسپاں کر دیے تو اس کا جواب ان کے پاس نہیں۔ میرزا اظہر جاوید یہ رودادِ چمن ہے۔ مجھے قفس میں بیان کرنے کا یارا نہیں۔ کہیں تم بھی اپنے پرچے میں میرا داخلہ ممنوع قرار نہ دے دو، مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ تخلیق تمہاری مملکتِ خداداد تھی، اب اس پر عذرا اصغر سریر آرائے سلطنت ہے۔ تم نے چاکری اختیار کی۔ اب تمہارا قلم دوسروں کا محتاجِ اجازت ہے۔ لہٰذا اس باب کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ خدا تمہیں آزادی نصیب کرے اور تمہارے دشمنوں کی روسیاہی ہو، اس خط کو "بت جھڑ کا آخری پتہ" کی رسید سمجھو اور عذرا اصغر تک یہ بات پہنچا دو کہ محبِ گرامی حضرت وقار عظیم ایک مذاکرہ اس کتاب پر یہاں ترتیب دے رہے ہیں، صدارت اس کی کے لیے میرا نام مجوّز ہے۔ مضامین باقر علی داستان گو، رجب علی بیگ سرور، میر امّن دہلوی، حیدر بخش حیدری اور للّو لعل جی پڑھیں گے۔ گویا بڑے بڑے داستان طرازنکتہ سرا ہوں گے۔ ادبا کی محافل میں تذکرہ اس تقریب کا یوں ہوتا ہے جیسے لال قلعہ میں مشاعرہ ہو۔ عذرا اصغر کا ذکر ہر جگہ ہے

واہ وا۔

اے بھائی! یہ ہوائی کس نے اڑائی کہ اُردو ادب پر اہلِ پنجاب کی اجارہ داری ہے۔ اور یہ جو رسائل نقوش، اوراق، تخلیق، ماہِ نو، محفل، نیرنگِ خیال دولِ پنجاب سے چھپتے ہیں۔ان سب نے اس روش قبیح کو عام کیا ہے۔ غالب دہلوی کا بیان قابلِ اعتنا سمجھو تو کہوں یہ محض فتنہ آرائی ہے۔ شورش پردازی ہے۔ ادب پر اجارہ داری کا تصوّر بے محل، بے معنی، مہمل، لغو، تم محبِ محترم ڈاکٹر وزیر آغا سے دریافت کرتے تو وہ تمھیں تخلیقی عمل کا وہی زاویہ دکھاتے اور جو ڈاکٹر محمد اجمل سے پوچھتے تو وہ از روئے نفسیات تمھیں اس فتنہ پرداز شخص کا منشاء مطلب پوشیدہ بتاتے اور جو دکتور ادب انور سدید سے استفسار کرتے تو وہ اس شاخسانے کا رشتہ ترقی پسند تحریک میں تلاش کرتا۔ پر میں تمھیں سمجھاتا ہوں کہ ادب کی کیفیت مثل شمع رواں کے ہے۔ آج یہاں کل وہاں، کبھی روشنی مشرق میں پھیلاتی ہے، کبھی مغرب میں۔ جن دنوں لال قلعہ میں مشاعرے برپا تھے اور خاقانی ہند کا طوطی بولتا تھا۔ اور حضرت عالم ابوالمظفر بہادر شاہ ظفر مشاعروں کی صدارت کرتے تھے ان دنوں پنجاب میں شاعری کا چراغ بھلا کہاں جلتا تھا، اس وقت کیا اُردو ادب پر دلّی کی اجارہ داری تھی؟

اے بھائی! ادب کی شمع لاہور میں جلی پر بہت دیر سے اور روشن رہی ہے تو اب تک، روشنی اس کی دور دور تک پھیلی، پر یہ روشنی کس نے پھیلائی، یہ شمع کس نے روشن کی، میرے فرزند دلبند الطاف حسین حالی نے اور صاحبِ نیرنگِ خیال مولانا محمد حسین آزاد نے۔ بھلا بتاؤ یہ دونوں ٹوٹے ہوتے ستارے کہاں کے تھے؟ اس شہر پارینہ دلّی کے جس میں غالب نے حیات جاوید پائی، جہاں مصطفیٰ خاں شیفتہ نے مشاعرے برپا کیے، جہاں مولوی ضیاء الدین احمد خاں ضیاء دہلوی نے علم کی ضیا بکھیری، اب یہ شمع لاہور میں روشن ہے۔ کون جانے کل کہاں ہوگی۔ پھر اس پر حیرت کا اظہار کیوں؟ میں تم سے کہتا ہوں کہ اس قسم کے بیانوں پر توجہ نہ دو، اور یہ جو کراچی میں نسیم دُرانی رسالہ "سیپ" اور صہبا لکھنوی جریدہ

"افکار" اور ڈاکٹر جمیل جالبی پرچہ "نیا دور" اور خواجہ حمید الدین شاہد مجلہ "سب رس" چھاپتے ہیں اور ادب عالیہ کی خدمت سرانجام دیتے ہیں اس کی داد دو، میاں، ادب پر پیغمبری وقت آپڑا ہے۔ ان اصحاب کی تحسین کرو کہ اُردو کا رسالہ چھاپتے ہیں۔ اور کارد بارزیاں میں شوقِ فراواں شامل کرتے ہیں۔ مسائل حکیمانہ کی ہستی، ترہاتِ ندیمانہ کی مستی، درد و درماں کے مدارج کا اظہار، افسانہ و افسوں کے مقاصد کا مدار، صرف و نحو کی رازدانی، استعارہ و علامت کی موشگافی، لفظ و معنی کی گل افشانی کرتے ہیں، وضاحتِ مزید کے لیے عرض کرتا ہوں کہ ادب از روئے مثال کیا ہے؟ چشمہ ہے؟ ندی ہے؟ سیل ہے؟ دریا ہے؟ کیسی روانی اور کس زور کا پانی، اس کا چڑھاؤ، اس کی رفتار، اس پر کس کا زور اور کس کا اختیار، جدھر منہ کیا، ادھر دریا بہا دیا۔ اور دریا کی لہر کیا گھوڑے کی باگ ہے کہ کسی کے ہاتھ ہو!

اے میاں یہ جو عبید اللہ علیم ہیں اور محسن بھوپالی اور اطہر نفیس اور افسر آذر اور محسن احسان اور زیتون بانو، اور ممتاز مفتی اور سعد اللہ کلیم، اور احمد داؤد، اور حامد بیگ اور وزیر آغا اور سجاد نقوی اور خورشید رضوی اور کیف انصاری اور راغب شکیب اور عرش صدیقی اور اصغر مہدی سب وابستۂ نطقِ سخن ہیں۔ سب کا کلام زیبا، سب کا اظہار مجلا، مشاہدہ ان کا نور افزائے نگاہ، تصور ان کا انجمن افروزِ خیال، از روئے لفظ اہلِ معنی کی نظر میں آئینۂ عارضِ جمال، شہر شہر ان کے افکار سے درخشاں، قریہ قریہ ان کے جمال سے خردمند، اس پر تمہارا اجارہ ہے اور نہ میرا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو غالب دہلوی کو "تخلیق" میں حسنِ مطلع کے طور پر نہ چھاپتے اور اکتفا طاہر تونسوی پر کرتے جو حصول شہرت و ناموری و ننگ و ناموس کے لیے واردِ لاہور ہوا۔ چندے قیام کے دوران تمام حربے مذموم استعمال کیے۔ ناکام ہوا پھر اپنی مٹی کے خمیر میں سما گیا۔ پہنچی وہیں پہ خاک ......

میری جان۔ یہ سلمان بٹ کون حضرت ہیں؟ قلم کاری شخص مذکور کی پہلے رسالہ "چٹان" میں پڑھی، اب جریدہ "زندگی" میں اس کے جولانیٔ افکار کا مذکور عام ہے۔ میرے پاس پروفیسر حمید احمد خاں بیٹھے ہیں، بتاتے ہیں کہ انگریزی زبان میں ایک

ترکیب زائد بیانی کی ہے جسے over statement کہتے ہیں، دوسری کم بیانی کی ہے جسے under statement شمار کرتے ہیں، دونوں سے صاحبانِ علم نے فائدہ اٹھایا ہے اور لطف زبان پیدا کیا ہے، سلمان بٹ چلیے بہانے استعمال دونوں کا کرتا ہے اور خوبی سے، لیکن جو اس نے میرے محب احمد ندیم قاسمی کے باب میں کہا ہے کہ کوئی ان کے بعد ان کی تحریروں کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کی تکلیف نہ کرے گا" محض کج بیانی ہے۔ تم دعا کرو کہ قاسمی صاحب کی عمر لمبی ہو۔ ان کی پلاٹینیم جوبلی کی تقریب کشور ناہید نیشنل سنٹر میں قائم کرے اور میں اسے دیکھنے کے لیے زندہ رہوں، تم رسالہ "تخلیق" کا ندیم نمبر شائع کرو۔ اور میں اس میں مضمون لکھوں۔ ایسی ہی ایک کج بیانی اوپندر ناتھ اشک نے اپنے میزبانوں کے سامنے کی اور احمد ندیم قاسمی کی مسندِ اوّلیت پر انگلی اٹھائی، انھیں پہلی رو سے انگلی پکڑ کر اٹھایا اور دوسری صف میں جا بٹھایا۔ سبحان اللہ! کیا یہ انصاف ہے؟ اے بھائی! میں سلمان بٹ کی بات نہیں کرتا۔ وہ میرے محب ندیم قاسمی کا نہ حریفِ ادب ہے، نہ حریفِ دشنام، لیکن یہ بات سمجھو کہ اوپندر ناتھ اشک ان کا حاسد فن ہے۔ میں اگر اس قسم کا بیان خاقانیٔ ہند کے زمانۂ حیات میں مذکور کرتا تو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور علاؤالدین علائی اور منشی ہرگوپال تفتہ اور الطاف حسین حالی میرے مذکور پر اعتبار ہرگز نہ فرماتے۔ اور بطورِ دفاع میری مے نوشی کا ذکر بالارادہ نہ کرتے۔ میخواری میری اختیاری ہے نہ کہ اشتہاری کہ ذکر اس کا ہر عامی کرے۔ پر یہ قاسمی صاحب کے مدّاحوں کو کیا ہوا کہ افسانے کے ذکر میں ان کی شرافتِ نسبی کو سرِعام ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ گویا

آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب نہیں

اوپندر ناتھ اشک کی آمدِ پاکستان پر اخبار امروز میں تمھارا کالم میں نے پڑھا تھا، ماہ وا" دل خوش ہوا۔ بیان سعادت حسن منٹو کا ہوا، پر داخل عیاں اشک کا کیا۔ سبحان اللہ، تم نے کیا سلیقہ سے قلم چلایا۔ رُخ ایک طرف، وار دوسری طرف" ذات کو ذات سے اور افسانہ نگار کو داستان گو سے ٹکرایا۔ اور کام بقدر لب و دندان خوب نکالا،

اور جو مدّاحانِ احمد ندیم قاسمی بھی یہ طریق استعمال کرتے کہ ممنوعہ ہرگز نہیں اور موازنہ ندیم واشک کرتے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا اور وہ جو ستم سلمان بٹ نے رسالہ چٹان میں اور انور سدید نے "اُردو افسانہ میں دیہات کی پیش کش" میں ڈھایا ہے اس کا جادو ٹوٹ جاتا۔ پر حیف قاسمی صاحب کو ایسا ندیم ملیسّر نہیں۔ ایک خالد احمد ہے، دوسرا امجد اسلام امجد، دونوں اپنی ذات کے اسیر، اور حسب مطالب قاسمی صاحب کے دامن گیر، اب سنا ہے کہ انور سدید کا مقالہ بصورتِ کتاب ہندوستان سے شائع ہو رہا ہے اور ناشر نے انور سدید کو مزید اضافوں پر مائل کیا ہے۔ تم دریافت کرکے لکھو کیا وزیر آغا نے اشاعت سے انکار کیا ہے؟

لو صاحب! تماشا دیکھا؟

اہلِ دہلی نے وزیر آغا کو بلایا۔ داستانوں کے مذاکرے میں مسند صدارت پیش کی، نابھ سے رام لعل، چندی گڑھ سے آزاد گلاٹی، کرشن ادیب، مالیگاؤں سے رئیس مالیگانوی، محمد عارف، پٹنہ سے رضوان احمد، دہلی سے گوپی چند نارنگ، بلراج کومل، محمود ہاشمی، بمبئی سے قرۃ العین حیدر اور راجندر سنگھ بیدی ان کی پذیرائی کو آئے۔ ان کی راہ میں دیدہ و دل بچھاتے۔ شومیِ قسمت دیکھو وزیر آغا کو ٹانگ کے درد نے آلیا۔ لوگ انھیں ملنے کے مشتاق، یہ درد سے بیزار، ایک عجیب کیفیت تھی کہ دیکھی جائے نہ سنی جائے۔ منیر احمد شیخ نے بعجلت واپسی کا انتظام بذریعہ طیارہ کیا اور حضرت موصوف مذاکرہ، تقریبات، مجالس سب چھوڑ چھاڑ سوئے لاہور سدھارے۔ مجھے بتاؤ اب کیا حال ہے۔ سنا ہے کہ معالج نے چلنے پھرنے انشائیہ پڑھنے اور تنقید لکھنے سے منع کیا ہے۔ البتہ ترتیب اوراق اور شاعری پر پابندی نہیں لگائی۔ اور یہ لاہور میں ادیبوں پر کیا قیامت کی گھڑی آئی ہے۔ احسان دانش بیمار، قتیل شفائی علیل، یوسف کامران صاحبِ فراش، رحیم گل صحت سے عاری، منصور قیصر دل زدہ۔ میں دعاگو ہوں اور بہر عیادت تمھیں لکھتا ہوں خدا ان سب کی عمر دراز کرے، ہزاروں جوبلیاں منائیں اور ہر جوبلی میں مقالے

پچاس ہزار ہوں!

کل ایک ٹوکرا تازہ رس دار آم کا ملتان سے عرش صدیقی نے بھجوایا۔ سبحان اللہ! سرآغازِ فصل میں ایسے ثمرہائے بیش رس کا پہنچنا نوید ہزار گونہ میمنت و شادمانی ہے۔ یہ ثمر ربّ النوع اثمار ہے اور غالب اس کا دل دار ہے۔ اس آم نے جو مزا عجیب دیا اس کی تعریف کیا کروں۔ وہ خوشبو جو ملتان کی مٹی سے اُٹھتی ہے بھلا لکھنؤ اور دلّی میں کہاں۔ میں نے ایک ایک آم بہ احتیاط اٹھایا۔ ایک ہزار اور صد بار منہ سے لگایا۔ اور عرش صدیقی کو دعا دی۔ سال گزشتہ تک یہ رسمِ قدیم سرِآغاز فصل وزیر آغا نبھاتے تھے۔ اب کے سال تعویق ہوئی تو بلا وجہ نہیں۔ لیکن میں تاحال امیدوار ہوں کہ اس طرف سے کب ابرِکرم آتا ہے اور اپنے ساتھ آم لاتا ہے۔

معلوم ہو کہ کراچی سے محب گرامی مشفق خواجہ ایک رسالہ الموسومؔ بہ "تخلیقی ادب" شائع کر رہے ہیں۔ ترتیب ان دنوں اس کی زیرِ عمل ہے۔ منصوبہ یہ ان کا خفیہ تھا، پر اب اس کی خبر عام ہو چکی ہے۔ تم سنو گے تو حیرت کرو گے کہ حضرت خواجہ نے کسی غزل گو سے کلام نہیں مانگا، میں نے بے طلب بھیجنے کا ارادہ بہ اساس تعلقاتِ دیرینہ کیا لیکن جب سنا کہ اس میں ایک گوشہ یاس یگانہ چنگیزی کے لیے وقف ہے تو میں نے ارادہ ترسیل کلام ترک کر دیا۔ اے میاں! اس سے بدگمانی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، تم پوچھ کر بتاؤ کہ صحیح صورتِ احوال کیا ہے۔ کیا واقعی یگانہ کو غالب پر فوقیت ہے؟

ماہر موسیقی رشید ملک کے جواب میں جو مضمون سجاد نقوی نے اوراق میں باندھا ہے آپ نے وہ ملاحظہ کیا؟ میں نے اس کا ایک ایک لفظ بغور سنا ہے۔ حوالہ جات کتب انگریزی بسیار ہیں۔ حمید احمد خاں کا ارشاد ہے کہ سب صحیح ہیں۔ ہر دلیل سجاد نقوی کی وزنی ہے۔ بحث اس سیدزادے نے پھیلائی اور پھر سمیٹی۔ سبحان اللہ! اس آشفتگی کی داد کس طرح دوں، ایک نظم میں نے مندرجات اوراق پر تصنیف کی ہے آج وزیر آغا صاحب کو مرسل کرتا ہوں۔ اس میں مضمون متذکرہ پر بھی تبصرہ شامل ہے۔

اب کے جو دو پارہ ہائے غزل تم نے اوراق میں تصنیف کئے وہ بے مثال ہیں، ایک کی داد ناصر کاظمی نے دی ہے، ابنِ انشا کہتے ہیں کہ سائیان، مہربان والی زمین میں غزل کہتا تو میں بھی ایسے ہی کہتا، میں تمہارے باب میں اسے تعریف سمجھتا ہوں۔ سنا ہے کہ فنانس کمپنیوں کا شاخسانہ اب پاکستان سے ختم ہوا۔ اب خالد احمد کیا کرتا ہے۔ کیا واپڈا نے اسے کارِ منصبی سونپا ہے۔ اگر صحیح ہے تو کیا اسے ثبات بھی ہے۔ سنا ہے کہ لاہور میں احمد ندیم کی زندگی میں وراثت کا جھگڑا اٹھا ہے۔ خالد احمد اور امجد اسلام امجد وارث قرار دیے جائیں۔

لاہور میں ایک صاحب نے میرا نام اور تخلص اختیار کیا ہے یعنی اسد اللہ غالب کہلاتا ہے۔ اے بھائی، اگر وہ اسد اللہ غالب ہے تو میں کچھ اور ہوں۔ اور میں اسد اللہ غالب ہوں تو وہ کیا ہے؛ تم اسے ملو تو اس کا حدود اربعہ لکھو۔ ایک شخص نے میری زندگی میں اسد تخلص کیا تھا۔ میں نے اس تخلص سے روگردانی اختیار کی۔ اب میرے نام پر بھی لوگوں نے نقب لگالی۔ بتاؤ کیا کروں! اے بھائی! اس صاحبِ عزّ و جاہ سے کہو کہ حسرت نام آوری کی ہے تو میرا دیوان ان کی نذر، میں خوش، میرا خدا خوش، پر اس پیرانہ سالی میں کہ قوا کمزور، بینائی کمزور، حافظہ کمزور، مجھے یوں رسوا نہ کرو، پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں، ایک صد برس بکا، نہ مدح کا صلہ ملا، نہ غزل کی داد۔ بقول انوری:

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
وے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل

سب شعرا اور احباب سے متوقع ہوں کہ مجھے زمرۂ شعرا میں شمار نہ کریں اور اس فن میں پرسش ہو تو اس لاہوری اسد اللہ غالب کی طرف ہو —— اے میاں، اس نامے کا جواب کب لکھو گے۔

تجھ پر یقین ہے ترے وعدے پر اعتبار
لیکن یہ انتظار کبھی مختصر بھی ہو

بھلا بتاؤ یہ شعر کس کا ہے کہ اسی پر خاتمۂ کلام ہوا ہے۔ والسلام

مورخہ ۲۶ رجون ۱۹۸۰ء — اسد اللہ خاں المتخلص بہ غالب

۱۱

کیونکر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں؟ ـــــ ہاں اتنا ہوش باقی ہے کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں، واہ کیا ہوشمندی ہے کہ قبلۂ اربابِ ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم، ـــــ سُن، غالب سُن، ہم تجھ سے کہتے ہیں، بہت مصاحب نہ بن اور تعریف عذرا اصغر کی اور توصیف اظہر جاوید کی اور اصغر مہدی کی یوں نہ کر کہ اربابِ کدورت پر بار گزرے اور وہ مدیرانِ "تخلیق" کو باور کرائیں کہ اشاعت تمھارے مکتوب کی موردِ تضحیک ان کی ہے، مانا کہ تو نے خط کو روزمرہ کی گفتگو اور آپس کا مکالمہ بنا دیا ہے اور اس پر داد حاصل کی ہے، کِس سے؟ اپنے فرزندِ دل بند الطاف حسین حالی سے اور اپنے محقق غلام رسول مہر سے اور اپنے محسن مولوی مہیش پرشاد سے اور اپنے دوست ڈاکٹر سیّد عبداللہ سے اور اپنے مدّاح وزیر آغا سے۔ اور سمجھتا رہا کہ یہ دھوپ تمھاری اپنی ساختہ ہے۔ اور تم اس کے آفتاب ہو، اس لیے روشنی اس کی دور دور تک اور حدّت و توانائی اس کی زمان و مکان پر محیط ہے۔ آپ لکھتا رہا، آپ ہی وجد کرتا رہا۔ یہ نہ سوچا کہ اغیار

اس پر کیا کہتے ہیں اور وہ جو خلشِ خار ان کے دل میں ہے اس کا رُخ عذرا اصغر کی طرف ہے۔ نوکِ خار خوں چکیدہ ہے کہ اشاعت ان خطوط کی بند ہو، میاں! یہ سب اپنی جگہ، مگر یہ تحریر کیا روش ہے؟ غالب! پہلے القاب لکھ، پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی پوچھ، پھر عنایت نامہ کے آنے کا شکریہ ادا کر کہ جو میں تصور کر رہا تھا وہ ہوا، یعنی پو پھٹتے تمہارا خط ملا، اس کے ساتھ ایک ملفوف عذرا اصغر کا تھا، دن ڈھلے حضور کا فرستادہ "تخلیق" ملا، گویا غالب نے عیدِ سہ گانہ منائی، دل خوش ہوا، تمھارے حضور میں بندگی کی، کورنش بجالایا۔

ناگاہ نظر "انجمنِ خیال" پر پڑی کہ اس میں ادیب، شاعر، نکتہ داں اپنی اپنی بولیاں بولتے ہیں، ان میں کچھ اربابِ علم میرے لکھے کی تحسین کرتے ہیں، کچھ اربابِ کدورت اپنا خبثِ باطن ظاہر کرتے ہیں، ہر چند بینائی کمزور اور قوا مضمحل ہیں، پر اپنا نام "انجمنِ خیال" میں لکھا پڑھ لیتا ہوں، ولایتِ انگلسیہ سے عابد وُدود صاحب نے میرے نامے پر داد دی، حضور کی خدمت میں میرا سلام پہنچے، مجتبیٰ مخدوم منوّر نے انور سدید کی نئی طرح کی تحسین کی، گویا مجھے یاد کیا، میرے طرز کو پسند کیا، ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کی نثری نظم کی داد دیتا ہوں، پھر حضرت مولانا خسروی کراچوی کے ارشاداتِ گرامی پڑھے، ناگاہ ایک نئی زمین خیال میں آئی، طبیعت نے راہ دی، غزل تمام کی، اسی وقت سے خیال میں تھا کہ کب صبح ہو اور کب اس غزل کے اشعار تابدار اظہر جاوید کو بھیجوں، خدا کرے آپ پسند کریں اور اصغر مہدی اور زمان کنجاہی کو سنادیں، اور میرے محبان عزیز راشد بزمی اور راز کاشمیری اور محمد احمد شاد اور رجان کاشمیری ان کو "تخلیق" میں پڑھیں۔ پروردگار اس مجمع کو سلامت رکھے؛

اے ذوقِ نواسنجی، بازم بخروش آور	غوغائے شبے خونے، بر بنگہ مہوش آور
گر خود نہ جہد از سر، از دیدہ فرو بارم	دل خوں و کن آں خوں را، در سینہ بجوش آور
ہاں ہمدمِ فرزانہ، دانی رہِ ویرانہ	شمعے کہ نہ خواہد شد، از بادِ خموش آور

کیا عجب میرے قبلہ حضرت مولانا خسروی کراچوی بھی ان اشعار کو پڑھیں اور پسند فرمائیں،

نامہ بر کی وساطت سے مجھے خبر دیں کہ اس میں آورد تو نہیں، اور اگر ہے تو کتنا؟

اے بھائی، نئے نئے خطاب اپنے محبوں کے لیے لکھنا میری عادتِ دیرینہ ہے، اور جو حضرت خسروی یہ اعتراض اٹھاتے کہ غالب مردہ نے عالی جانا، عالی شانا کیوں نہیں لکھا؟ تو درست ہوتا۔ اس صورت میں واقعی گردن زدنی اپنے آپ کو گردانتا، وجہ؟ اختراع، ایجاد، موشگافی، نکتہ سنجی میری فطرت ہے، میں نے ان سب کے استعمالِ فراواں سے اپنے کلام کو چمکایا ہے اور ارباب ادب سے یعنی مصطفیٰ خاں شیفتہ سے الطاف حسین حالی سے، عبدالرحمان بجنوری سے، ڈاکٹر خورشید الاسلام سے، محمد حیات خاں سیال سے، ڈاکٹر معین الرحمٰن سے اور خسروی کراچوی سے داد پائی ہے۔ "جانا عالی شانا" میری وضع کردہ ترکیب اور اس پہ مہرِ غالب ثبت، یعنی جو اور کوئی استعمال کرے وہ سارق شمار ہو، میں نے یہ القاب اپنے خطوط میں علاؤالدین خاں علائی کے لیے لکھا، وہ بھی صرف ایک مرتبہ، دوسری مرتبہ تمہارے نام کے ساتھ لکھا اور یہ بلا وجہ نہیں، پاکستان میں جو ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں وہ میرزا اظہر جاوید ہے۔ اور وہ مجھے ضیاءالدین نیّر اور علاؤالدین علائی کی طرح عزیز ہے اور علائی کے عہد میں ہوتے تو میں ضیاءالدین نیّر کے بعد تمھیں اپنا خلیفۂ ثانی اور علائی کو خلیفۂ ثالث شمار کرتا، نیّر اور علائی کو تو تم پر تقدم زمانی ہے، اس لیے میں تمھیں جانشینِ ثالث کہتا ہوں، اب جو اس جانشینی کو انعام الحق جاوید تمھاری تعریف سمجھیں، اور آتشِ حسد سے جلیں اور اس پر مضمون باندھ کر اخبار میں چھپوائیں اور مزاج خفی پیدا کریں تو آپ کو ملال اس کا ہرگز نہ ہو، اے میاں، اب روشِ زمانہ تبدیل ہو گئی ہے حق بات کا صلہ کیا ہے؟ دشنام، افترا، بہتان!

واضح ہو کہ روشِ زمانہ کے خلاف اظہارِ مدعا کے لیے یہ تین الفاظ میرے اپنے نہیں، میں نے یہ اپنے ایک ترقی پسند محب سے مستعار لیے ہیں، تفصیل اس اجمال کی پوچھو تو عرض خدمت ہے کہ اگلے روز ابن انشا نے میرے پاس قدم رنجہ فرمایا تھا، اگست سن اسّی عیسوی کا ایک رسالہ ان کے ہم دست تھا، اس کا شذرۂ اوّل ابن انشا نے پڑھا۔ میں نے بگوشِ ہوش سنا، ایک ایک لفظ سے رنج و ملال عیاں، ایک ایک

لفظ سے رقّتِ قلم ظاہر! ارشاد ہے کہ

"بہتان، افترا اور دشنام —— آج ہماری ادبی دنیا کے ایک بڑے حصے کا سکّۂ رائج الوقت یہی ہے۔ وہ لوگ بھی جنھوں نے معلّمین اخلاق کا منصب سنبھال رکھا ہے گالی مکے بغیر بات نہیں کرتے۔"

اے میاں! گالی، دشنام، افترا، ہرزہ، بہتان کس زمانے میں سکّۂ رائج الوقت نہیں رہا۔ سنو، دلّی میں بہادر شاہ ظفر کا سکّہ نہیں چلا، انگریز بہادر کی گالی مقبول ہوئی، عظیم سے عظیم انسان اس کے استعمالِ بدبہیہ میں شہرت رکھتا ہے، میں کثیر المقاصد آدمی ہوں، پتے ضرورت اس کے بے تکلف استعمال سے گریز نہیں کرتا۔ استعمال کے طریقہ سلیقہ میں دستگاہِ خاص رکھتا ہوں اور جو کوئی اچھی گالی تخلیق کرے اسے داد کھل کر مثل شعر دیتا ہوں، انوار الدولہ شفق کے نام میرا خط تمھاری نظر سے گزرا ہو تو ملاحظہ فرماؤ۔ میں نے صاحبِ غیاث اللّغات کے لتے کیونکر لیے اور جو نہ دیکھا ہو تو دوبارہ درج کرتا ہوں:

"غیاث اللغات ایک نام مُوقّر و معزّز، جیسے الفربہ خوامخواہ مرد آدمی، آپ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے؟ ایک معلّم فرومایہ مثل طاہر تونسوی یا سلیم اختر، رام پور کا رہنے والا، فارسی سے ناآشنائے محض اور صرف و نحو میں ناتمام، "انشائے خلیفہ" اور منشآتِ مادھورام کا پڑھانے والا، چنانچہ دیباچہ میں اپنا ماخذ بھی اس نے خلیفہ شاہ محمد و مادھورام و غنیمت و قتیل کے کلام کو لکھا ہے۔ یہ لوگ راہِ سخن کے غول ہیں آدمی کے گمراہ کرنے والے، یہ فارسی کیا جانیں۔"

اب تم کہو گے اس سلکِ ادب میں دشنام کہاں؟ میں کہوں گا، غالب علیہ الرحمۃ کیا اپنی زبان ماں بہن کی گالی سے آلودہ کرے گا، اے بھائی۔ ادیب، خطیب، شاعر اور نقاد دشنام کے سکّے کو اسی انداز میں استعمال کرتے ہیں، اپنا غصہ نکالتے ہیں۔ کینہ فرو کرتے ہیں اور جو کوئی دوسرا پڑھے تو ادب اور دشنام میں فرق نہ نکالے، اور جو تم م۔ ی قیصرانی کو مامور کرو تو وہ اس مقبولِ عام سکّے کی تاریخ دریافت کریں اور تحریر کریں کہ غالب سے پہلے کے سکّوں پر کون کون دشنام درج تھے، غالب نے اس میں کیا کیا ترکیبیں اختراع کیں

اور اب میرزا اظہر جاوید کے عہد کے سکوں پر کونسی گالی کندہ ہے؟ اور ان میں فرق مزاج کا ہے یا صرف طرزِ دشنام بدلا ہے؟ اب جو انور سدید کسی کو ریاکار، کسی کو گرگے پال، کسی کو بڑبولا، کسی کو بے لگام، کسی کو ناشائستہ کہے تو کیا تم اسے زبانِ ادب قرار دو گے؟ اور جو پروفیسر محمد عثمان جیسے ثقہ آدمی کسی کو لینن اور کسی کو زار کہیں تو کیا تم اسے دشنام نہیں کہو گے؟ دمِ تحریر شوکت تھانوی میرے پاس تشریف فرما ہیں۔ لینن اور زار کا نام سن کر چونکے ہیں، دریافت فرماتے ہیں، ان دو حضرات نے پاکستان میں قدم رنجہ فرمایا ہے تو کہاں فروکش ہیں اور ان دونوں کے درمیان راسپوٹین کون ہے؟ میں کہتا ہوں،

"مزاح، بذلہ، پھبتی، لطیفہ، اپنی جگہ، اے میاں شوکت تھانوی، ذرا آہستہ بولو، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور جو یہ بات لاہور تک پہنچی تو لوگ برا منائیں گے۔ پاکستان میں بقول شخصے قریب قریب ہر اہم ادبی شخصیت اور ادارے نے اپنے اپنے گرگے پال رکھے ہیں اور جو کسی نے تم پر حملہ کر دیا تو اپنی خیر کیونکر مناؤ گے؟" متذکرہ بالا شذرے کے لکھے کو سچ سمجھو اور ایسے عناصر کا انسداد و تدارک کہ تیغ تیز کرو۔"

اے میاں اظہر جاوید۔ تم پاکستان کے اہم ادیب ہو اور "تخلیق" تمہارا ادبی ادارہ ہے، میں دریافت کرتا ہوں کہ تم نے کتنے گرگے پال رکھے ہیں۔ اور ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے گرگے کون ہیں۔ کہاں ہیں اور اب تک کیوں بے ننگ و نام ہیں۔ اس بات کو باندازِ دگر کہوں تو یوں کہ یہ سب غیر اہم ادیب ہیں۔ محمد حسین آزاد مؤلف "دربارِ اکبری" یہ بیان بگوش ہوش سنتے ہیں اور خواہشمند ہیں کہ تم اہم ادیبوں کے کوائف اور ان کے گرگوں کے حالات بہم پہنچاؤ تو وہ آبِ حیات سے ادبائے قدیم کا باب خارج کریں اور ایک باب جدید ادب کا شامل کریں اور اس میں احوال اہم گرگے پال ادیبوں کا درج کریں، اور جو سلیم اختر نے "مختصر تاریخ ادب اردو" میں ان اصحاب کبیر کا نام درج کر دیا ہو تب بھی لکھو، سنا ہے کہ اس نے کتاب مذکور سے

"دبستانِ سرگودھا" کا باب بر بنائے رنجش نکال دیا ہے، اے بھائی، اس نے ایسا کیوں کیا؟ رنجش کو آسودہ کرنے کا طریق بھلا یہ کیا ہے؟ مقصود نام آوری تھا تو دبستانِ سرگودھا کے بالمقابل دبستانِ سلیم اختر کا باب باندھتا، طاہر تونسوی کو اپنا خلیفۂ اوّل نامزد کرتا، دین و دنیا میں سرخرو ہوتا۔ ناآشنائی کا یہ طریق بھلا کہاں مستحسن ہے؟

سنا ہے کہ شہر لاہور میں حافظ محمود شیرانی کی صد سالہ تقریبات کا انتظام بصد اہتمام ہوا، ہند و پاک کے علما و فضلا اس میں شریک ہوئے، صدارت اوّلیں جلسے کی میرے فرزند معنوی علامہ اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال نے کی، مینارڈ ہال کا نام بدل کر شیرانی ہال رکھا گیا۔ واللہ، یہ سب سنا اور خوش ہوا کہ پاکستان میں زندوں کو کوئی نہیں پوچھتا لیکن مرے ہوؤں کی قدر ہوتی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد عالم بالا سے اس جلسے کا احوال دیکھتے تھے، بتاتے ہیں کہ حاضری بہت کم تھی، یونیورسٹی کے طلبہ اور طالبات کہ شیرانی مرحوم کی کتابوں سے فیض اٹھاتے ہیں قہوہ خانوں میں خوش گپیوں میں مصروف رہے، ڈاکٹر جاوید اقبال کا مضمون کس نے سنا؟ سینیٹ ہال کی کرسیوں نے، تم نے اس قومی خفت کو مٹانے کے لیے "محفل محفل" میں روداد اس جلسے کی تفصیل سے لکھی اور ایک پرچہ مظہر محمود شیرانی سے لے کر اخبار امروز میں چھاپا، میں تمہارے لکھے کو سچ جانتا ہوں، محمد حسین آزاد حافظ محمود شیرانی کے بارے میں خلشِ خار دل میں رکھتا ہے، تنقیدِ آبِ حیات درمیان میں کانٹا ہے، مجھے لکھو کہ صحیح احوال کیا ہے اور یہ جو محمد علی صدیقی نے رسالہ "افکار" میں لکھا ہے کہ شیرانی کا نظریہ ابتدائے اُردو منسوخ ہو گیا بر بنائے حقیقت ہے یا بر بنائے ترقی پسندی، اور ڈاکٹر حکم چند نیّر، اور ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر امیر حسن عابدی اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار بھارت جا کر صد سالہ تقریباتِ شیرانی کا احوال کیا بیان کریں گے؟ اے بھائی، اوائل سال میں ڈاکٹر وزیر آغا، انتظار حسین اور احمد ہمیش اُردو افسانے کے سیمینار میں شرکت کے لیے ہندی زبان کے دیش میں گئے تھے، تفصیل اس سیمینار کی رسالہ اوراق میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے لکھی ہے، اب ان دونوں جلسوں کا موازنہ کرو اور لکھو کہ اردو کے

قومی وطن پاکستان میں اس زبان کے زعما سے کیا سلوک ہے اور ادھر بھارت میں اصنافِ ادب اور زعمائے اصنافِ اُردو کی کیسی قدر ہوتی ہے۔ ہاں عذرا اصغر کو جو پذیرائی ملی وہ مستثنیات میں شمار کرتا ہوں، شہر شہر تقریبات ان کی منعقد ہوئیں، اہلِ ادب نے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے، لکھنے والوں نے پرچے پڑھے، سننے والوں نے بگوشِ ہوش سنے، پر ہر دفعہ یوں لگا کہ حسرت پوری نہیں ہوئی، کتاب ان کی مقبول ہوئی، سنا ہے کہ تم نے دو تین جگھوں پر سبیلِ مذاق پیدا کی، پہلے طاہر تونسوی کو کہا کہ مضمون باندھو، پھر انور سدید کو کہا کہ جواب آں غزل کہو، دونوں کا مکالمہ روبرو حاضرینِ مجلس کروایا۔ اربابِ جلسہ نے مناظرے کا لطف اٹھایا۔ واہ وا عذرا اصغر کی اور تمھاری ہوئی، یہ خبر افضل آرٹس تک نہیں پہنچی؟ اور کیا اس نے مضمون اس پر باندھا ہے؟

مکتوبِ گزشتہ میں لکھا تھا اور اب پھر تم سے کہتا ہوں کہ ماہرِ موسیقی رشید ملک کے حالات فرستادہ معلوم ہوئے، مزید معلومات اس بارے میں سجاد نقوی کے مضمون مندرجہ "اوراق" سے معلوم ہوئیں، عزیز "معاصر" میں نے سید جابر علی سے بوساطت حسین سحر منگوا کر دیکھا، ہرچند اعتراض ان کا لغو اور پرسش ان کی بے مزہ ہے۔ مگر سید سجاد نقوی نے حسبِ منصب جواب اس کا ترکی بہ ترکی لکھا، اہلِ دانش نے اس کی داد دی، تفصیل اس کی جریدۂ "اوراق" میں چھپی اور جو نہ دیکھی ہو تو اب ملاحظہ کرو، پروفیسر انور محمود خالد نے اس مضمون کو محرک مطالعہ قرار دیا ہے اور کتاب "اُردو شاعری کا مزاج" موصوف نے دوبارہ پڑھی ہے، مزید لکھا ہے کہ رشید ملک کے دلائل تاش کے پتوں کی طرح بکھر کر رہ گئے، جمیل آذر نے فرمایا کہ رشید ملک کا مضمون تعصب اور غلط فہمیوں کا نمونہ ہے، جمیل یوسف کا ارشاد ہے کہ بلاجواز، بے بنیاد اور تلخ تنقید کا جواب سجاد نقوی نے شائستگی سے دیا ہے، ثمینہ راجہ رشید ملک کا مضمون پڑھ کر الجھ گئی تھیں، اب سجاد نقوی کو پڑھ کر سلجھ گئی ہیں، یہ سب پڑھ کر دل خوش ہوا، سید زادے نے جاں کاہ جوابی حملہ کیا، فتح و نصرت کا جھنڈا اگاڑا، اب اس پر بھی ریاکار، گرگے پال، بے لگام

بڑبولے اور ناشائستہ لوگ نہ سمجھیں، نہ سمجھیں، اور جو تم میرے اس جملے پر اعتراض کرو تو تمھیں حق ہے۔ وجہ؟ یہ میری زبان نہیں، میں نے زمانۂ حال کے اہلِ فنون سے سیکھی ہے اور اب استعمال اس کا بے محابا کرتا ہوں کہ یہ سکۂ رائج الوقت ہے اور وقت کے سکّے کو استعمال نہ کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔ اس سے ہمیں کام نہیں کہ کوئی مانیں یا نہ مانیں، کلام ہمارا اپنے نفس میں معقول و استوار ہے، جو اہلِ نظر ہوگا سمجھ لے گا، غلط فہم اور کج اندیش نہ سمجھیں اور شکوہ اس کا عذرا اصغر سے کریں کہ تخلیق کی مدیرہ مسئول ہیں، اے بھائی، ہم کو تمام خلق کی تہذیب و تلقین سے کیا علاقہ، تعلیم و تلقین واسطے دوستوں کے اور یاروں کے ہے، نہ واسطے اغیار کے، تمھیں یاد ہوگا میں نے تمھیں بارہا سمجھایا ہے کہ خود غلطی پیر نہ رہو اور غیر کی غلطی سے کام نہ رکھو، تمھاری سرخروئی دنیا میں اسی باعث ہے۔ مزید اضافے کی دعا کرتا ہوں۔

جانِ جاں! ملکِ پاکستان سے ایک اور بدخبر آئی ہے، وہ جو انتشار بیٹے اور باپ کے درمیان، شاگرد اور استاد کے درمیان اور اجیر اور آجر کے درمیان اربابِ سیاست نے پیدا کیا تھا اب پھیل کر ضخیم ادبی رسائل اور قلیل الجثہ ماہانہ جرائد کے درمیان بھی پیدا ہوگیا ہے۔ ریڈیو لاہور نے اس پر ایک مذاکرہ نشر کروا دیا، اور گرامی مدیرانِ جرائد کو مرتّبین قرار دیا۔ مزید تضحیک یہ کہ انھیں "دکاندار مرتّبین" کہا، میرزا ادیب نے کہ خود ایک ماہ نامے کے مدیر رہ چکے ہیں اس بحث میں شرکت کی لیکن موضوعِ متنازعہ کا جواب نہیں دیا۔ پھر اخبار "نوائے وقت" میں سوال اٹھایا لیکن مسئلہ زیرِ بحث کو بلطائفِ حیل ٹال دیا۔ انور سدید نے اس بحث کو طول دیا۔ مگر تشنہ، میں نے وہ مضمون پڑھا ہے،— درمیان سے چند کڑیاں غائب نظر آتی ہیں، کیا عجب انور سدید نے کچھ اور لکھا ہو اور وہ مقراضِ مدیر کی زد میں آگیا ہو، اے بھائی، جو تم سمجھے ہو تو بتاؤ کہ یہ شاخسانہ کیا ہے؟ مدیر اور دکاندار مدیر کی حدودِ امتیاز کیا ہیں اور مرتب کسے کہتے ہیں، ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ اور یہ دکاندار مرتّبین کا اشارہ کس طرف ہے؟ حکیم یوسف حسن کی طرف؟ جو طباعت کی آمدنی نیرنگِ خیال کی نظر کرتے ہیں، نذیر احمد چودھری

کی طرف ؟ جس نے نفع کتابوں کا "سویرا" میں صرف کیا، شاہد احمد دہلوی کی جانب ؟ جو ریڈیو سے موسیقی بکھیرتے، پر ساقی کو موجبِ روزگار نہ بنایا، مولانا صلاح احمد کی طرف ؟ جن کے نمک کے کاروبار کا تمام منافع "ادبی دنیا" کھا گیا اور مولانا دنیا سے گئے تو دونوں ہاتھ خالی، اشارہ محمد طفیل کی طرف ہے ؟ جو ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتابیں چھاپ کر گزر اوقات نقوش کی کرتے ہیں، اے بھائی! وزیر آغا کی کاشتکاری سے "اوراق" کی آبیاری ہوتی ہے تو کیا بُرا ہے اور جو تم اخبار امروز کی مزدوری سے روزہ "تخلیق" کی نذر کرتے ہو تو اس پر اعتراض کیوں ؟ کیا یہ سب ایثار پیشہ لوگ دکاندار مرتبین ہیں ؟ گزشتہ سے پیوستہ روز مولانا صلاح الدین احمد نے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا۔ کیفیت ان کی سراسیمگی کی چہرے سے ہویدا۔ ملال ان کے دل کا آنکھوں سے عیاں، میرا ماتھا ٹھنکا، میاں اظہر جاوید میں تو کورنش بجالانا بھول گیا۔ عرض پرداز ہوا، مولانا! ملال اس شاخسانے کا زنہار نہ کیجئے، بس طفلانِ ناشائستہ کی گل افشانیِ گفتار کا نظارہ کیجئے، آپ کے عہد میں ادبی جریدہ ایک نصب العین پختہ رکھتا تھا۔ اب یہ زیبائشِ شخصیت کا وسیلہ اور کسبِ زر کا وسیلہ ہے۔ اور یہ جو چند رسائل اوراق، نقوش، تخلیق، سیپ اور افکار نکلتے ہیں اور عہدِ گزشتہ کی یاد تازہ کرتے ہیں سو ان کا دم غنیمت ہے۔ خدا انہیں بادِ مخالف سے محفوظ رکھے کہ یہ رسائل اب نقصانِ مایہ اور شماتتِ ہمسایہ سے دوچار ہیں پر اشاعت ادب کے لیے آپ کے نقوش پا پر چلنے اور کاروبارِ زیاں کے لیے بے قرار! مولانا ایسے ہی زیاں پسندوں سے روشنی پھیلتی ہے، ادب کو فروغ ملتا ہے، وزیر آغا نے اوراق میں جو شذرہ لکھا ہے اس موضوع پر وہ تمہاری نظر سے گزرا ؟ واہ کیا شائستہ انداز ہے، دودھ کو پانی سے الگ کر دکھایا ہے، نہ کسی کو ریاکار کہا ہے، نہ بڑ بولا، نہ بے لگام، نہ گرگے پال، لیکن زبان کا چٹخارہ موجود، مضمون کا مطلب عیاں، صداقت ظاہر اور حقیقت کی چھبن نمایاں، مولانا صلاح الدین احمد نے دیکھا، آنکھوں سے لگایا۔ ایک ایک لفظ کی داد دی، فرمایا:

"ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم، غزل، تنقید، انشائیہ وہ نہیں کہ کوئی اس پر گرفت کر سکے۔ مگر میاں ع

"حسود را چہ کنم کو ز خود برنج دراست"

مولانا کی آنکھوں کی چمک ظاہر کرتی ہے کہ اپنے آپ کو داد دیتے ہیں۔ اے بھائی، کیوں نہیں، وزیر آغا کے پروان میں مولانا کا سلیقہ قدرِ غالب رکھتا ہے۔

سنا ہے کہ انور سدید نے اپنے نہاں خانۂ خیال سے جو خطوط میرے دریافت کئے ہیں، ان کا ایک مجموعہ مرتب کر لیا ہے اور پیش لفظ اس مجموعے کا لکھنے کی عرضداشت اس نے تمھیں بھیجی ہے، مزید مجھے لکھا ہے کہ اس باب میں میرزا اظہر جاوید سے سفارش کروں، تم میرے دوست، صادق الولا ہو، سو یہ کام بغیر سفارش کر گزرو، وگرنہ میری جان! جو خجالت مجھ کو انور سدید سے ہوگی شاید بسبب عبادت نہ کرنے کے قیامت میں خدا سے بھی نہ ہوگی، اور بسبب خلاف شرع کرنے کے پیغمبر سے بھی نہ ہوگی۔ خدا ہی جانتا ہے جو میرا حال ہوگا۔ اس حال سے نجات تمھاری دسترس میں ہے۔ شاعری میں میرے نام لیوا مملکتِ پاکستان میں بہت ہیں۔ نثر میں شخص مذکور ہی میرا نام لیوا ہے، سو اس کی دلجوئی تمھارا فرض!

اے لو، میرے شفیقِ مکرم کنہیا لعل کپور کلبۂ احزاں میں تشریف لا رہے ہیں، ساتھ ان کے میراجی، یوسف ظفر، ن۔ م۔ راشد، مختار صدیقی، اور مجید امجد ہیں۔ حالی میری دائیں جانب فروکش ہیں۔ کلیان نے حقہ تازہ لا رکھا ہے، جدید شعرا کا مشاعرہ ہونیوالا ہے۔ صدارت میرے سپرد ہے، کنہیا لعل کپور اپنی بغلوں میں مسکرا رہے ہیں۔ جو سنتا ہے وہ حیران ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ تمھیں زندہ رکھے اور جو کنہیا لعل کپور روداد اس جلسے کی لکھے تو تم اسے امروز میں چھاپنے سے زنہار انکار نہ کرنا۔

۱۶ اکتوبر سن اسّی عیسوی

مرگِ ناگاہ کا طالب

غالب

۱۲

اے جناب اظہر جاوید صاحب!

"السلام علیکم"

"حضرت آداب!"

"کہو صاحب، آج اجازت ہے عذرا اصغر کی خدمت میں خط لکھنے کی؟"

"حضور! میں نے عذرا اصغر کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ غالب علی شاہ مبتلائے بخار ہے، نظام ہضم میں اختلال کا شکار ہے۔ میں ہر ملاقات میں آپ کی طرف سے دعا عرض کر دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔"

"نہیں۔ میرزا اظہر جاوید، ان کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے، وہ خفا ہوں گی، جواب لکھنا ضرور ہے۔"

"حضرت! وہ آپ کی نیاز مند ہے۔ آپ سے کیوں خفا ہوگی بھلا!"

"بھائی، آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟"

"اے لو، حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے!"

لو میاں، اب تم سے مکالمہ ختم کرتا ہوں اور گریز تنویر ظہور کی طرف ہوتا ہے۔ یہ بات اس نے بر سبیلِ ذکرِ غالب اٹھائی کہ "تخلیق" کی بساط پر اب سر ریآرائے ادارت عذرا اصغر ہے لیکن غالبِ نکتہ داں کا مخاطب تا حال میرزا اظہر جاوید ہے۔ ایسا کیوں؟ ۔ حضرت میں نے مکتوبِ سابق میں لکھا تھا اور اب پھر عرض پرداز ہوں کہ میرے احباب میرن صاحب ہیں، میر مہدی مجروح ہیں، نواب مصطفٰے خاں شیفتہ ہیں، خواجہ حالی ہیں، سید عبداللہ، وزیر آغا، محمد حیات خاں سیال، معین الرحمٰن، اظہر جاوید اور رفیع الدین ہاشمی ہیں، ان میں سے کوئی طبقۂ اناث میں سے نہیں، میں عمر بھر ان سے رشتۂ محبت باندھے رکھا، ان احباب نے مجھ سے التفات کیا، رقعے لکھے، دیوان جمع کیے، شعر سنائے، داد حاصل کی، ایک صد سال سے اوپر عرصہ بیت گیا ہے، مجال ہے کہ نگاہِ محبت میں ذرا کجی آئی ہو، میرے بارے میں ان کی رائے میں ارتداد پیدا ہوا ہو، وجہ، ہمارا اور ان کا رشتہ مطلب اور مقصد سے عاری ہے، بے لوث ہے۔ بے ریا ہے، پھر وجہ نزاع کیوں پیدا ہو، بلا شبہ غالب کو طبقۂ اناث سے خطاب کا شرف حاصل ہوا ۔ پر وہ خطاب بالواسطہ اور بوسیلۂ اشعارِ غزل تھا۔ اب تنویر ظہور عذرا اصغر سے بالراست خطاب کا تقاضا کرتا ہے تو کیوں؟ اے بھائی غالب کا تعلقِ خاطر عمر بھر کا ہوتا ہے اور وہ اس میں لاگ اور لگاوٹ کو داخل نہیں کرتا۔ تنویر ظہور آمادۂ شر ہے اور مجھے ان ادبا میں شامل کرنے کے درپے ہے جو کسی عفت مآب، نیک و معصوم خاتون کو خواہر، کسی کو دختر کہتے ہیں، جنون آرائی مزاج کے لیے دلِ آشنائی ڈھونڈتے ہیں، اے بھائی! علاقہ محبت ازلی کو برحق مان کر اور پیوندِ غلامی جناب علی مرتضٰی کو سچ جان کر ایک بات کہتا ہوں کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے اور حسینوں، مہ جبینوں کا جلوہ مثل کحل جواہر ہے مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشناسی اس کے اجارے میں آئی ہے اور یہ بھی دلیل آشنائی ہے، لیکن بتاؤ، کیا فرض ہے کہ جب تک دید وا دید نہ ہو لے اپنے کو بیگانہ دگر سمجھیں۔ جو تم یہ نکتہ سمجھو تو عرض کروں کہ عذرا اصغر "تخلیق" کی مدیرہ ہے اور مجھے اس سے ہزار مطلبِ اشاعت ہے لیکن میرے

لیے وہ عزیز گرامی اصغر مہدی کی زوجہ ہے اور اصغر مہدی میرا شفیقِ پارینہ و ہمدم دیرینہ ہے، لہٰذا احترامات اور واجبات کی ہر نہایت مجھ پر فرضِ عین ہے۔ اور جو میں نے ان کو خط نہیں لکھا تو باعث اس احترام کے ہے۔ کل روز میں نے رسالہ "سب رس" میں جسے خواجہ حمید الدین شاہد کراچی سے چھاپتے ہیں منظر امکانی کا یہ جملہ پڑھا کہ "عذرا اصغر تقریر میں تحریر اور تحریر میں تصویر ہے" ـــــ واللہ میں نے اس بلیغ جملے کی داد دی۔ لیکن کیونکر! آنکھوں پر پردہ ڈال بھویں جھکا کر، اے بھائی! اسے لطیفہ سمجھو جو یہ لکھا ہے کہ مجھے عذرا اصغر کو خط لکھنے سے تم باز رکھتے ہو۔ یہ پابندی میں نے خود عائد کی ہے اور اب بھی تنویرِ ظہور نہ سمجھے تو اس کو سمجھاؤ۔

میری جان! معلوم ہوا کہ ایک کانفرنس اہلِ قلم کی اسلام آباد میں بصد احتشام، انصرام و انتظام منعقد ہوئی، منصرم اس کے اکادمی ادبیات پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل مسیح الدین صدیقی تھے۔ اہتمام اس کا شاہانہ اور انتظام شاعرانہ تھا، انور سدید نے مجھے لکھا ہے کہ بدولت اس کانفرنس کے ادبائے پاکستان اسلام آباد ہوٹل میں فروکش ہوئے، دو روز تک آسمان سے من و سلویٰ اترا، ادبا فیض یاب ہوئے، ایوانِ صدر میں باریاب ہوئے، آخری روز مشاعرے کی صدارت ابوالاثر حفیظ جالندھری نے کی اور ان کے ارشاد پر صدرِ مملکت بمعہ جملہ حاضرینِ مجلس ایستادہ اپنی نشستوں کے سامنے ہوئے اور قومی ترانہ اپنے خالق کی زبان سے سُنا۔ اختتامِ جلسہ پر پروفیسر پریشان خٹک نے کہا کہ "پہلے شعرا سوئے زنداں جاتے تھے اب جانبِ ایوانِ صدر رواں ہیں۔" میں نے سنا تو خوش ہوا کہ ملکِ پاکستان میں شعرا کی قدر دانی ہے ہر چند اس جنس کی پاکستان میں ارزانی ہے۔ لیکن بعد از کانفرنس یہ کیا بدگمانی ہے کہ ہر ہمہ شمہ نے اہلِ قلم کی کانفرنس کی تضحیک کی ٹھانی ہے اور جو بیدار سرمدی نے لکھا ہے کہ "صدرِ مملکت نے ادب کی جن گندی مچھلیوں کو تالاب سے باہر نکال پھینکنے کا مشورہ دیا تھا وہی اکادمی ادبیات کی انتظامیہ پر کنٹرول کرتے نظر آئے" ـــــ تو اشارہ بیدار سرمدی کا کن گندی مچھلیوں کی طرف ہے؟ اور جو عطاء الحق قاسمی نے شکایت کی ہے کہ "اس کانفرنس میں جن سے ملنے کو جی نہیں چاہتا تھا ان سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔" تو یہ

انگشت نمائی کن" روسیاہوں" کی جانب ہے اور کون لوگ ہیں جن سے نفرت کا بیج عطاءالحق قاسمی کے معصوم دل میں صورتِ شجر اختیار کر گیا ہے اور منصور قیصر نے کن چہروں کو دکھا دے کا دانہ شمار کیا ہے۔ اور سرور مجاز نے یہ اعتراض کیوں اُٹھایا ہے کہ مندوبین نے مقالے سننے کے بجائے خواتین کی پذیرائی کی! میاں پذیرائی خواتین کی فرضِ عین ہے، سرور مجاز اس میں مانع کیوں ؟ کیا مقصود یہ کہ سب لوگ غالب خستہ کی طرح آنکھوں پر احترام و حیا کی پٹی باندھ لیں اور جو کوئی خوبرو سامنے آئے تو آنکھیں جھکا لیں۔ اے بھائی کیوں ؟ اور جو یہ بات ہے تو خوب روؤں اور پری جمالوں کو اس کانفرنس میں مدعو کیوں کیا گیا ؟ کیا ادب کے قدیم مقبروں سے رونقِ پارینہ پیدا ہو سکتی تھی ؟

سنا ہے کہ استادِ جامعہ پروفیسر نبی بخش بلوچ کو ادبا کے مسائل کمیٹی کا رکنِ رکین نامزد کیا گیا، لیکن ادبا اپنے نمائندوں کا انتخاب نہ کر سکے، دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئے، ایک نے وزیر آغا کا نام بلند کیا، دوسرے نے جنابِ آں غزل کے طور پر احمد ندیم قاسمی کو اُچھالا، اس دوران میں "آپ" "جناب" "معظم" اور "مکرم" کے مصنف کو انجم رومانی نے ادیب ماننے سے انکار کر دیا اور نبی بخش بلوچ کی اس پھبتی کا نوٹس کسی نے نہ لیا کہ "شعراو ادبا صرف کھانے کی میز جمع ہوتے ہیں۔" اے بھائی! یہ کیا بات ہے ؟ انور سدید نے لکھا کہ کھانے پر عجیب نفسانفسی کا عالم تھا، ہر ایک کو اپنی پلیٹ کا دوزخ بھرنے کی تعجیل تھی اور سلیم اختر کی طشتری مشکور حسین یاد کی رکابی سے ٹکرا رہی تھی، میں نے یہ سوانح لیل و نہار، اخبار امروز، نوائے وقت، جسارت اور چٹان میں پڑھے۔ پر رویا نہیں اور چپ بھی نہیں رہا۔ بس۔

"جلاد کو لیکن کہے جاتا ہوں کہ ہاں اور"

میرزا اظہر جاوید، یہ ایک لاکھ روپے کا شاخسانہ کیا ہے ؟ اور یہ میرے محب مکرم و محترم احمد ندیم قاسمی کے نام کیونکر منسوب ہوا ؟ اور رار بابِ کینہ نے ان کے اس شعر میں تعلّی کا پہلو کیوں تلاش کیا:

سوکھی ہوئی ٹہنی پہ میں جل جاؤں گا لیکن قسمت سے طلبِ موسمِ باراں نہ کروں گا

اور جو اکادمی ادبیات نے بتوسط وزارتِ تعلیم اس خبر کی توثیق نہیں کی تو وضاحتِ احوال اور تردیدِ مزید کی ضرورت کیوں؟ لے لو، حضرت احمق پھپھوندوی قدم رنجہ ہیں، شگفتہ رو متبسم چہرہ، مسکراتے ہیں اور کہتے ہیں۔ غالبِ نکتہ داں سنو، ایک دفعہ ایک دیہاتی سوتے دہلی پھول والوں کا میلہ دیکھنے آیا۔ شومئی قسمت سے میلے میں اس موصوف کا کمبل چوری ہو گیا۔ اگلے برس پھر میلہ منعقد ہوا، بہادر شاہ ظفر نے قدم رنجہ فرمایا۔ دیہاتی سے کسی نے پوچھا "میاں میلہ دیکھنے نہیں گئے" وے حضرت منہ بسور کر بولے "میلہ کا ہے کو ہے۔ میرا کمبل چرانے کا بہانہ ہے؟" حضرت احمق پھپھوندوی اب زیرِ لب معنی خیز مسکراہٹ سے دریافت کرتے ہیں کہ مذکورہ خبر "سوکھی ہوئی ٹہنی" والا شعر سنانے کے لیے گھڑی گئی ہے کیا؟ —— اور خالد احمد قریب ہوں تو پوچھو، حضرتِ احمق پھپھوندوی کو یہ حکایت اور یہ پس منظر آں حضرت نے مرسل کیا ہے؟ یا یہ ان کی اپنی اختراع ہے؟ جانِ جاناں جو یہ خبر میرے نام معنون کرو تو واللہ کہتا ہوں، پہلے ایک لاکھ روپے دو، پھر جو جی میں آئے کہو! حکومت کی قدر دانی سے انکار کفر ہے اور میں اس کفرِ قبیح کا مرتکب ہرگز نہیں ہوں گا۔ تم نے سُنا کہ وزیر آغا کو جو دو مربع اراضی کا کاشتکار ہے بعض کینہ پرور، حاسد اور ٹُھڑ دلے جاگیر دار شمار کرتے ہیں؟ ایک روز آغا حضرت اس پھبتی پر ملول بیٹھے تھے۔ ناگاہ پرنسپل غلام جیلانی اصغر آ گئے، اپنے ہمدمِ دیرینہ کی حالت نہ دیکھ سکے اور فرمایا: آغا اپنی تمام اراضی میرے نام کر دو، پھر ان زنخوں کو مجھے جاگیردار کہنے دو، میں ان سے خود نپٹ لوں گا —" اسے بھائی، کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے، جو حکومت پاکستان آمادۂ خیر ہو تو ایک لاکھ روپے میرے نام کرا دو، میں اپنے بدخواہوں سے خود نپٹ لوں گا۔ اسے لو، روپوں کا نام سن کر امراؤ بیگم بھی پاس آ کھڑی ہوئی ہیں۔ کہتی ہیں، ہنڈی کب آئے گی، میں اس روپے سے نواب زین العابدین کا غسلِ صحت مناؤں گی؟ گویا یک نہ شد دو شد۔

بندہ پرور! آدمی کو موافق اس کی تمنا کے آرزو برآئی محال ہے اور جو لوگ تمنا کے دوسرے قدم کو رعایتی نمبروں سے حاصل کرنے کے درپے ہیں اور الل ٹپ بھاگ رہے

ہیں بالآخر منہ کی کھاتے ہیں۔ سنا ہے کہ ماہرِ جنسیات و نفسیات پروفیسر سلیم اختر اپنی سابقہ آراسے مرتد ہوگیا ہے اور وہ سب کچھ کر گزرا ہے جس کا شور طاہر تونسوی نے برپا کر رکھا تھا۔ اُردو کی پاکٹ بک تاریخ کا چھٹا ایڈیشن بصورتِ ارتداد مطبوع ہوا۔ حضرت قاضی عبدالودود کو یہ تالیف ادارہ سنگِ میل نے برائے تنقید ارسال فرمائی، حضرت نے بالالتزام نقاد موصوف کی ترمیماتِ آرا کی تحقیق کی صحتِ کلام سے انکار کیا۔ شبینے کو محمد حسن عسکری سے فرمارہے تھے کہ وہ حضرت چھٹے ایڈیشن میں صاحبِ دبستان نہیں رہے اور یہ جو سلیم احمد نے ان پر پوری کتاب لکھی ہے اور مشفق خواجہ نے اس کتاب کو "تخلیقی ادب" کی جلد اوّل میں سر فہرست چھاپا ہے تو یہ محض غوغا آرائی ہے۔ اور تحسین فراقی کی اس رائے میں کوئی وزن نہیں کہ "اُردو تنقید کی نئی بوطیقا معرضِ وجود میں آئے گی تو اس کی اساس محمد حسن عسکری کے گراں مایہ تنقیدی افکار پر ہوگی"۔ اے میاں، تحسین فراقی جس کو گراں مایہ کہتا ہے سلیم اختر اس کو فرومایہ شمار کرتا ہے میں نے دونوں کی آرا کو تولا ہے۔ تحسین فراقی محض ادب کا طالب علم ٹھہرا فی الحال اس کی طلبِ صادق اور اظہار مبنی بر دیانت اور تنقید خالی از مقصد ہے۔ مشفق خواجہ نے بتوسط ڈاکٹر وحید قریشی اس سے پہلا تنقیدی مضمون لکھوایا۔ ہر چند وہ نیا نقّاد ہے پر مطالعے کا شوق و ذوق پختہ اور رعایتی نمبر حاصل کرنے کا رجحان ناموجود، اس لیے اس کی رائے پُر اعتماد ہے۔ میرے مربّی و محسن ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں اس نے لکھا ہے کہ "ان کی تنقید کی بڑی خوبی ان کا تفکّر ہے۔ تجزیاتی صلاحیت کا بھی انھیں بہرۂ وافر ملا ہے"۔ یہ رائے مبنی بر دیانت ہے۔ مکتسب بر حقیقت ہے۔ قابلِ اعتنا ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر آغا افتخار حسین، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے بھی اس قسم کی رائے پہلے دی تھی۔ صرف سلیم اختر نے خیانتِ مجرمانہ اختیار کی، اور اب پاکٹ بک تاریخ ادب اُردو میں لکھا ہے کہ "ان کی تالیفات کا بطور خاص نوٹس لینے کی ضرورت نہیں"۔ اے میاں سلیم اختر، تم سے کس نے کہا کہ کسی تصنیف کا بطور خاص نوٹس لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر اچھی تصنیف اپنی طرف خود راغب کرتی ہے۔ آپ سے مکالمہ کرتی ہے، ذوق اور فکر کو مہمیز لگاتی ہے، لکھنے پر آمادہ کرتی ہے اور پھر خوشبو بن کر قریہ قریہ پھیل جاتی ہے۔

محمد حسن عسکری اور وزیر آغا کو میں ایسے ادیبوں میں شمار کرتا ہوں جن کا اپنا ایک زاویہ نظر ہے اور اس کے اظہار کا ایک الگ اسلوب ہے۔ ان کا ذکر ایوانِ غالب میں ہر روز ہوتا ہے۔ صاحبانِ فکر و نظر ان کے لکھے پر گفت گوئے مکرر کرتے ہیں گویا اپنے ذہنوں کو اور افکار کو اُجلا کرتے ہیں۔

اے بھائی، تخلیق کو غالب خستہ تنقید پر فوقیت دیتا ہے۔ لیکن میں تخلیق کو نقاد کی بے لاگ رائے سے الگ کرنے کے حق میں نہیں ہوں، اس کی دیانتِ رائے پر انحصار کرتا ہوں اور جو نقاد ہر طبع تو میں اس دیانت سے روگردانی اختیار کرے۔ اس کو نقاد نہیں سمجھتا، سمجھو اس نے اپنا گلہ خود اپنی چھری سے کاٹا۔ ابنِ انشا کہتے ہیں کہ یہ عالم سلیم اختر کا ہے کہ مُصنّفین سے قطع نظر اصناف سے بھی جلا پا کرتا ہے، انشائیہ کے باب میں اس نے واقعی سیاپا کیا ہے، سلیم اختر کی سائیکی میں یہ تبدیلی کیونکر آئی، وہ تو اس صنف کا مدّاح تھا اے بھائی، تعمیرِ مکان کے بعد کہیں وہ قرضے کے بوجھ تلے تو نہیں آگیا؟ اور یہ جھلاہٹ اسی باعث تو نہیں؟

میرزا اظہر جاوید! سال گزشتہ عذرا اصغر کے افسانوں کی تصنیفِ لطیف چھپی، شہر شہر، نگری نگری چرچا ہوا۔ سلیم اختر کے خلیفۂ اوّل طاہر تونسوی نے اس پر مضمون باندھا گوجرانوالہ، ڈیرہ غازی خاں، ملتان میں اسے بہ تکرار پڑھا۔ اظہر ادیب نے اسے نمایاں طور پر رسالہ "آگہی" و "اسلوب" کے شمارۂ اوّل میں چھاپا۔ کیا سلیم اختر مریضِ آشوبِ گوش و نظر ہے کہ اسے نہ یہ چرچا سنائی دیا۔ نہ کتاب دکھائی دی، سالِ گزشتہ کے تخلیقی جائزے سے ذکر اس کتاب کا موقوف کیا۔ پاکٹ بک تاریخ میں تخلیقی ادب کا منظر نامہ موجود، لیکن نام عذرا اصغر کا غیر موجود۔ سنا ہے کہ تم نے حرّیت میں ایک داستان بیان کی اور لکھا کہ سلیم اختر کی مثال اس حرّافہ بڑھیا کی ہے جس نے مرغ کا گلا دبوچ رکھا تھا اور کہتی تھی "دیکھتی ہوں کیسے بانگ دیتا ہے۔ کیسے صبح ہوتی ہے"۔ اور تم نے امروز میں کس نقاد کا ذکر کیا ہے کہ صبح سلام نہ کرو تو دوپہر کو درپئے آزار اور جو شام کو چائے پر بلالو تو آمادۂ تحسین۔ مجھے تو اس آئینے میں سلیم اختر کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ سو عذرا اصغر کا ذکر اس کتاب میں نہیں تو بندہ پرور! ملال اس کا ہرگز نہ کریں، مشفق خواجہ کے مرتبہ دس سالہ جائزے میں پروفیسر عتیق احمد نے یہ ذکر

تفصیل سے کیا ہے۔ گویا جو بددیانتی عذرا اصغر کے باب میں سلیم اختر نے اختیار کی اس کی تلافی
عتیق اللہ نے کر دی اور بروقت، بلا تاخیر۔

واقعہ ——

غلام الثقلین نقوی انشائیہ نگار، ناول نویس، مزاح نگار استادِ اُردو گورنمنٹ کالج
لاہور، وزیر آغا، انور سدید اور اظہر جاوید کے حلقۂ احباب میں شمار ہوتا ہے۔ سلیم اختر
نے ان کے بارے میں جو حروفِ خیر کتاب مذکور کے طبعِ اوّل میں رقم کیے تھے۔ طبعِ ششم
میں ان کی تکفیر اختیار کی، افسانہ نگاری میں یہ مقامِ محمود انھوں نے میرزا ریاض کو دے دیا ہے
سنا ہے کہ خواجہ محمد سعید کی مدتِ ملازمت پوری ہو چکی، اب وہ ریٹائرمنٹ پر آمادہ ہیں۔ اور
میرزا ریاض دوبارہ صدرِ شعبہ بننے والے ہیں۔

جملہ معترضہ ——

فرخندہ لودھی کے باب میں سلیم اختر نے تاحال اپنی رائے نہیں بدلی اور کیوں بدلیں، صابر
لودھی شعبۂ اُردو میں موجود ہیں، لہٰذا اس رائے کو ثباتِ عارضی حاصل ہے۔

میرے آشنائے قدیم مشفق خواجہ نے تخلیقی ادب کی دو جلدیں چھاپیں، مجھے ہدیتہً
ارسال کیں، تم خط لکھو تو میرا شکریہ بھی رقم کرو، میں نے وہ باب غور سے پڑھا جو یگانہ چنگیزی
پر مرتب ہوا ہے۔ واللہ، اس شخص پر غالب شکنی کی تہمت ناحق ہے۔ میں تو بنستِ یگانہ،
اور شیخ انصار حسین اور دوارکا داس شعلہ کے مضامین مبنی بر حالات و واقعات و حادثات
یگانہ پڑھ کر پہروں ملول رہا۔ بھلا زندگی خود جس کے درپئے آزار ہو وہ غالب شکنی پر کیوں
اترے گا، یگانہ تو اثباتِ غالب ہے۔ اے بھائی، مشفق خواجہ کو متوجہ کراؤ کہ وہ ایک باب
میرزا غالب پر بھی باندھیں، یگانہ کے بعد ممدوح یگانہ اس کا حق دار و طلب گار ہے۔

تم نے حکیم یوسف حسن صاحب کے سانحۂ ارتحال پر جو مضمون باندھا ہے وہ میں نے
بچشم نم پڑھا۔ لیکن حقیقتِ حقّہ کچھ اور ہے، اے میاں، یہاں ڈاکٹر تاثیر، عبدالرحمٰن چغتائی،
عبدالمجید سالک، مجید ملک، امتیاز علی تاج سب حکیم صاحب کے لیے چشم براہ تھے، سو
حکیم یوسف حسن فوت نہیں ہوئے، عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کو ہجرت کی ہے۔ تم انھیں

مردہ نہ کہو، زندوں میں شمار کرو جب تک اردو زبان زندہ ہے اور راوی قلعہ لاہور کے پاؤں میں بہہ رہا ہے حکیم یوسف حسن زندہ رہیں گے، میں خوش ہوا کہ انھوں نے عنانِ ادارت نیرنگِ خیال کی سلطان رشک کو سونپ دی اور اس نے نیرنگِ خیال کا گولڈن جوبلی نمبر دو ضخیم جلدوں میں حکیم صاحب کی ہجرت سے قبل چھاپا۔ آفریں صد آفریں، حکیم صاحب کے فیضِ خاص کو جاری رکھا، ساحرؔ لدھیانوی پر تم نے جو کالم لکھا تھا وہ دلّی کی ایک خاتون نے اپنے نام سے چھپوا لیا۔ اے میاں مُبارک ہو، تم خواتین میں مقبول تھے اور اب تمھاری تحریریں بھی خوبروؤں کو پسند آ گئیں اور جو مجھے یہ سعادت نصیب ہو تو اپنا تمام دیوان حضور کی نذر کر دوں:

انور سدید نے لکھا ہے کہ تم نے اس کی تالیف "غالب کے نئے خطوط" پر تقریظ لکھدی ہے۔ گویا یہ کرم فرمائی حضور نے میری ذات پر کی ہے اور اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میاں منصور قیصر اور منظر امکانی پھبتی ہزار کسیں پر میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ نثر میں شخص مذکور ہی میرا نام لیوا ہے۔ فقیر محمد خالد اختر نے اس روشِ خاص میں نام پیدا کیا تھا۔ لیکن اب عرصہ سے اس وادی کی سیر نہیں کی، مکتوبِ خضر نہیں لکھا، تم نے سنا سجاد نقوی کے نوجوان بھائی سیّد جوّاد حیدر نے زندگانی سے منہ موڑ لیا اور عالم جاودانی کو رخصت ہوا۔ بے چارہ سجاد نقوی اس صدمے سے نڈھال ہے، البتہ غلام الثقلین نقوی نے اسے حوصلے سے سہار لیا ہے۔ حیدر قریشی کی غزل پر میں نے تخلیق میں مضمون پڑھا ہے۔ یہ نوجوان اپنی قوّتِ فن پر آگے آ رہا ہے، اسے نظرِ بد ضرور لگے گی، راغب شکیب نے عرصے سے اردو زبان نہیں چھاپا۔ کیوں؟

آج میں اور بھی باتیں کرتا مگر میرا خاص تراش آ گیا ہے۔ مہینے بھر سے حجامت نہیں بنوائی، خط لپیٹ کر ڈاک میں بھیجتا ہوں اور خط بنواتا ہوں۔

جمعہ ۲۳ جنوری ۱۹۸۱ء

تمھاری خوشی کا طالب

غالب

۱۳

ہاہاہا۔ میرا اظہر جاوید آیا۔ مجلّہ تخلیق لایا۔

آؤ بھائی، مزاج تو اچھا ہے۔

بیٹھو، اور بتاؤ کہ تم ملتان کی ولایت میں کیوں گئے تھے۔ اور گئے تھے واپس کیوں آ گئے؟

ملتان اولیاؤں کا آستان ہے۔ لیکن مشہور ہے کہ وہاں افراط گرد و گرما و گورستان کی ہے۔ حضرت کشفی ملتانی فرماتے ہیں۔ میرزا غالب وہ قصہ پارینہ تھا۔ اب ملتان مہ جبینوں کی جنت ہے، اور جو شام کو حسین آگاہی کی طرف گزر ہو تو پری جمالوں اور شیوہ خیالوں کا طوفانِ رنگ و بو مثلِ لعل جواہر نظر آئے۔ تھوڑے سے فاصلے پر طبقۂ عشاق کا دریا چناب ہے۔ پانی اس کا شیریں، مصفّٰی اور لذیذ۔ بے شبہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اس سے ملی ہے۔ خیر یوں بھی ہے تو بھائی آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے۔ لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔ حضرت کشفی فرماتے ہیں کہ پاک صاف آبخورے میں اگر پانی اس دریا کا ڈالا جائے، اس میں تھوڑا سا عرقِ گلاب کا ملایا

جائے، اس پر صافی لپیٹ کر ہوا میں لٹکا دیا جائے اور پو پھٹنے سے پہلے دو گھونٹ نوش جان کئے جائیں تو عرقِ انگور کا لطف و سرور حاصل ہوتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ

"بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے"

اور "لطفِ کرم بدولت مہماں اٹھائیے"

کیوں ؟

کہ "عرضِ بساطِ انجمن رنگ مفت ہے"

سنا ہے کہ حکیم عبدالمجید راحی نے اپنا آستانہ اس دریا کے کنارے بنایا ہے اور اس چشمۂ صافی سے بوتلیں بھرتا ہے اور لوگوں میں تقسیم کرتا ہے جو تم اس سے ملو تو کہو

"اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی"

میں نے خطِ گزشتہ ۲۳ جنوری کو مرقوم کیا۔ ہر چند تمہارا مجلّہ "تخلیق" ترتیب و آرائش کی منزل سر کر چکا تھا پر تم نے اشاعتِ آئندہ پر ٹالنے کے بجائے اشاعتِ حالیہ میں شریک کیا۔ اطلاع اس کی عذرا اصغر نے بتاخیر کی۔ میں تمہارا اور عذرا اصغر دونوں کا احسان مند ہوں، صاحبِ "خرابات" عبدالحمید عدم پاکستان سے حال ہی میں واردِ خلد آباد ہوئے ہیں، آب انگور کی تلاش میں غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمایا۔ میں نے حضرت سے تمہارا حال دریافت کیا۔ بولے "شیر لو ہے کے جال میں ہے"۔ میرا ماتھا ٹھنکا عدم نے فرمایا:

ایک فتنہ تو میرزا غالب تمہارا خط ہے کہ ہر مرتبہ اظہر جاوید پر گلوخ اندازی کی خبر لاتا ہے۔ اب دوسرا فتنہ کراچی سے اٹھا ہے۔ اِدھر اخبار "حرّیت" کی ادارت سے انور خلیل نے ہاتھ کھینچا۔ اُدھر ابنِ کراچی نے بِل میں سے سر نکالا۔ اظہر جاوید کے خلاف قیامت برپا کی۔ واقعات، خیالات اور تصورات کے چند سے جڑ گئے، کالم لکھوائے۔ مقصد یہ ہے کہ رودِ راوی سے جو موجِ ادب آتی ہے وہ امرو ہے کے ساحل سے کیوں ٹکراتی ہے۔"

اے میاں! تم نے اچھا کیا کہ اپنی خودی اور خودداری کی حفاظت کی۔ حرّیت

کی کالم نگاری سے ہاتھ کھینچا۔ بھلا بوجھو تو یہ ابن کراچی کون ہے؟ سنا ہے کہ اک وجود فرضی ہے۔ جس کی ہر رگ میں خون ..... کا رنگ بدل جاتا ہے۔ کہیں کی اینٹ ہے کہیں کا روڑا ہے اخبار حریت نے اس سب سے کالم جوڑا ہے۔ جس کسی کے خلاف حریت میں سازش اٹھانا ہو خدمات ابن کراچی کی حاضر! اسلوب اس عزیز کے ہیں نصر اللہ خاں امرتسری کی جھلک ہے۔ مضمون کی ترتیب سے انداز منظر امکانی کا عیاں ہے۔ اور جو نفس ناطقہ پر نظر ڈالو تو یار آشنا محمد علی صدیقی سے ملاقات ہوتی ہے۔ ممکن ہے یہ سب ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس پردے میں کوئی اور منصور بول رہا ہو۔

سنو! مرد مبارز انور سدید گزشتہ ماہ سیاحت کراچی سے سرافراز ہوا، احوال اس سیاحت کا اس نے مجھے ایک طویل نامۂ روح پرور نشاط انگیز میں لکھا۔ میں نے کہا، اظہر جاوید تمہارا دوست ہے۔ اس سیاحت نامے کو اخبار امروز میں چھپواؤ، عذرا اصغر تمہاری مدّاح ہے۔ تم نے اس کی کتاب "پت جھڑ کا آخری پتّہ" پر مضمون ماہِ نو میں باندھا، اسے کہو، روداد اس سفر کی "تخلیق" میں شائع کرے اور جو قطع و برید کا بُرا نہ مانو تو پورا مسوّدہ وزیر آغا کو بھیجو اور فیصلہ ان پر چھوڑ دو کہ وہ اسے اوراق میں چھاپتے ہیں یا راغب شکیب کے حوالے کرتے ہیں کہ وہ اسے جگہ "اردو زبان" میں دے۔ مقصود یہ ہے کہ خبر اس سیاحت کی دور دور پہنچے۔ منظر امکانی اس پر کالم باندھے، منصور قیصر پھبتی کسے اور سفرنامے میں جھک مارنے والے رنجیدہ ہوں کہ ایک اور آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آمادۂ سفر ہے۔ اپنی مسافتوں کا احوال رقم کرتا ہے، اپنے شوقِ آوارگی کی دھول کو سمیٹتا ہے۔

ایک لطیفہ اس ضمن میں تمہارے گوش گزار کرتا ہوں۔

انور سدید نے ایک تبصرہ نصر اللہ خاں کی کتاب "بات سے بات" پر رسالہ "اوراق" میں لکھا۔ قیام کراچی کے دوران جب وہ دفتر افکار میں صہبا لکھنوی اور شہزاد منظر سے مصروفِ ملاقات تھا تو خان صاحب قبلہ نے ٹیلیفون کھٹکھٹایا۔ انور سدید سمجھا اپنی کتاب کا ذکر حضرت موصوف کریں گے۔ اہلِ قلم کانفرنس میں جو ملاقاتِ مختصر

اسلام آباد ہوٹل کی غلام گردش میں ہوئی تھی، اس کا مذکور اور چاتے پر تجدید ملاقات کے شوق کا اظہار ہو گا۔ لیکن حضرت، کیا بتاؤں، نہ تجدید ملاقات، نہ ذکر کتاب، نہ شوقِ دیدار، خان صاحب قبلہ تو جیسے ایک خلشِ خار سے دوچار تھے۔ چھوٹتے ہی بولے:

"واللہ باللہ میں نے حریت میں کالم نہیں لکھا۔ میں ابن کراچی سے واقف نہیں ہوں، لوگ ناحق اس کالم کو مجھ سے منسوب کر رہے ہیں۔"

اب انور سدید حیران کہ خان صاحب کس کالم کا ذکر کر رہے ہیں، اظہر جاوید سے دوستی بر حق اس وقت صفائی کا محل کیا ہے؟ شام کو مشفق خواجہ نے یہ عقدہ کھولا کہ یہ کھیل بھی ابن کراچی کا رچایا ہوا ہے۔ "جسارت" میں جو "مکتوب غالب" اظہر جاوید کی حمایت میں چھپا ہے ابنِ کراچی نے اس پر ایک کالم "حریت" میں باندھا ہے اور لتے انور سدید کے لیے ہیں کہ وہ اظہر جاوید کی حمایت میں کیوں صف آرا ہے۔ نصر اللہ خاں صاحب مع قع شناس اہلِ صحافت میں سے ہیں۔ وہ ٹیلیفون پر اپنا بیان صفائی دے رہے تھے ۔ محمد علی صدیقی پاس کھڑے سُن رہے تھے۔

اے بھائی! تم کھو گئے اس بیان واقعہ سے بھلا لطیفہ کہاں پیدا ہوا؟ میں عرض پرداز ہوں کہ نصر اللہ خاں صاحب نے کالم نہیں لکھا ۔ درست! لیکن بیانِ صفائی کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ کیا لطیفہ نہیں؟ اے بھائی یہاں مجھے ایک لاکھ روپے کے شاخسانۂ قدیم کی یاد پھر آ رہی ہے۔ "اک تیر ہے کہ ......" میرے محبّ محترم احمد ندیم قاسمی نے عذرِ گناہ قبل از گناہ پیش کیا۔ گویا ایک لاکھ روپیہ ناگاہ ضائع کیا۔ یہ بدتر از گناہ ہے۔ تم بتاؤ کہ یہ ہوائی کس دشمن نے اڑائی ہے کہ غالب نے ہنڈی وصول کر لی ہے۔ اور "مہرِ نیم روز" کو اس رقم سے چھاپا ہے۔ اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن نئے سرورق کے ساتھ چھاپنے کے درپے ہے۔ اے بھائی! کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے ۔ یہ افترا ہے، بہتان ہے، دشنام ہے۔ مہر نیم روز چھاپنے کے ذرائع الگ ہیں اور ان کی پردہ پوشی خوفِ فسادِ خلق کی بنا

پر ضروری ہے۔ ایک لاکھ روپے کی ہنڈی کا البتہ انتظار ہے۔ اس پر نظر میری بیگم نے جما رکھی ہے۔ وہ اس سے نواب زین العابدین عارف کا غسلِ صحت منائیں گی۔ میں اس میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ حکومتِ پاکستان اس عطیّے کا فیصلہ میرے حق میں کرے تو مجھے اطلاع بذریعہ تار برقی دو اور لکھو کہ ہنڈی کب ملے گی؟ اور باعثِ تاخیر کیا ہے؟

ان دنوں پاکستان کے اخبارات میں ذکر سلیم اختر کا بوسیلہ "اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" مسلسل ہو رہا ہے۔ انتظار حسین نے موازنہ اس تاریخ کا مولوی محمد حسین آزاد، رام بابو سکسینہ اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخوں سے کیا اور وہ نسخہ دریافت کیا جس سے یہ تاریخ بسیار فروخت ہوئی اور مصنف شادمان ہوا۔ "آبِ حیات" میں آزاد فرخ نہاد نے میرا ذکر بغض کینہ کے بغیر نہیں کیا۔ اور تادمِ تحریر اس کے کینے میں کمی نہیں آئی، پَر میں نے اس کا بُرا نہیں مانا۔ ہر چند اس کتاب کے تسامحات اور اغلاط کا جواب حافظ محمود شیرانی نے دیا۔ پر میرا ذکر مولوی آزاد نے اس کتاب سے تا حال خارج نہیں کیا، بلکہ ایک بحث ہے کہ سلیم اختر کے زمانے تک چل رہی ہے۔ اور فیصلہ ہر دور میں اس کی بابت کہ ذوق بڑا شاعر ہے یا غالب ارباب فکر و نظر کرتے ہیں۔ تاریخ کا اصول یہی ہے کہ جو ایک دفعہ اس میں جگہ پا جائے وہ خارج نہیں ہو سکتا۔ سلیم اختر نے اس اصول سے روگردانی اختیار کی ہے تو وہ زندانیِ مقاصد نظر آتا ہے۔

انور سدید کو کیا سوجھی کہ سلیم اختر کی تاریخ سے جنس نگاری کا زاویہ تلاش کیا اور خوجی کو آزاد کے مقابل کھڑا کر دیا اور جو سلیم اختر اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ کتاب اس کی نزاعی ثابت ہوئی ہے تو کیا غلط ہو گا۔ پر حضرت کو معلوم ہو کہ جو کذب صداقت کی غلیل سے اُڑ جائے وہ نزاعی نہیں ہوتا بلکہ خود مصنّف کے درپئے آزار ہوتا ہے اور نقّاد و مؤرخ و نکتہ داں کی رائے برسات کا موسم نہیں ہوتی کہ گرجے تو گرجتی جائے اور برسے تو برستی جائے اور جو سچ پوچھو تو میں انتظار حسین کی مضمون آرائی پر خوش ہوا۔ نظر اس

مضمون میں سلیم اختر کی تصویر سے نہیں ہٹتی، جتنی تاریخ مختصر ہے اتنی ہی تصویر مفصل ہے۔ اور جو مضمون کے بین السطور دیکھو تو انتظار حسین نشانہ اِدھر باندھتا ہے، غلّہ اُدھر چھوڑتا ہے۔ پھر توصیف ملیح اتنی شائستہ کہ مصنف سلیم اختر پڑھے تو خون کے گھونٹ پیئے اور کتاب کی شان میں ایک جملہ بھی رسالہ "فنون" میں اقتباس نہ کر سکے، سنا ہے کہ یہ بہت سی تاریخوں کا کیپسول ہے۔ سلیم اختر ہر ایڈیشن میں اس کیپسول کے اجزا ء بدل ڈالتے ہیں لہٰذا ہر ایڈیشن کا ذائقہ جدا۔ "تاثیر الگ"، "آبِ حیات" اس کا مقابلہ کیونکر کریگی۔ جس کی تاثیر از اول ایڈیشن تا آخر ایڈیشن ایک ہی ہے۔ اگر آٹھواں ایڈیشن طبع ہو چکا ہو تو اس کا ایک نسخہ مجھے بھجوانا۔ میں بھی تاریخ میں جگہ پانے والے نئے ادیبوں سے آشنا ہونے کا متمنّی ہوں اور اس تاریخ سے نکل جانے والوں سے اظہار افسوس کرنے کا آرزو مند ہوں۔

جانِ جاناں طاہر تونسوی ان دنوں کہاں ہے۔ لاہور بدری کے بعد اب کس شہر کی خاک چھانتا ہے؟ اپنے استاد صاحب قبلہ کی حمایت میں اس نے قلم اب تک نہیں اُٹھایا۔ کیوں؟ ویسے حضرت نے رسالہ "فنون" میں دشنام طرازی کی مہم کو تیز کیا۔ طاہر تونسوی نے اس میں بھی ہمنوائی سلیم اختر کی نہیں کی۔ استاد کا بیج ثمر بار کیوں نہیں ہوا۔ کیا زمین شور تھی۔ بیج کمزور تھا یا کمی آب کی شکایت تھی۔ سنا ہے کہ حیدر قریشی اس کا رخ موضع کروڑ پکاسے سونے خان پور موڑنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ اور فیصل آباد سے ڈاکٹر معین الرحمٰن گورنمنٹ کالج لاہور میں صدر شعبۂ اُردو مقرر ہوئے ہیں۔ اور سلیم اختر خوش ہے کہ اس نے موصوف کا ذکر اپنی تاریخ میں پیشگی کر رکھا ہے اور اگلے برس جو ایڈیشن شائع ہوگا۔ اس میں معین الرحمٰن کا ذکرِ مزید بکثرت ہوگا کہ بعہدۂ صدر تعیناتی سے ان کا حق اب سب پر فائق ہے۔ اور جگہ کی کمی کے باعث میرزا ریاض اور غلام باز انور سدید محذوف ہو جائیں تو دونوں حضرات اس کا برا ہرگز نہ مانیں۔ تم نے سنا اُردو افسانے کی کتاب سے سلیم اختر نے انور سدید کے پیش لفظ کو خارج کر دیا ہے۔ ہائے مصنف موصوف نے یہ پیش لفظ کتنی عرضداشتوں سے لکھوایا تھا۔ اور انور سدید نے کیا

افراتفری میں لکھ دیا تھا۔ اور جتنی تعریف سلیم اختر کو درکار تھی۔ وہ قُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْداً۔ کے پیش نظر نہیں کی تھی۔ میاں، دیباچہ کتاب مثل تقریب سالگرہ کے ہوتا ہے کہ بچہ بدصورت ہو تب بھی تعریف کی فراوانی میں کمی نہ ہو۔ شاید انور سدید اس حقیقتِ حقہ سے واقف نہیں تھا۔ یا شاید واقعہ یہ ہو کہ سلیم اختر نے حال ہی میں ترقی پسند مافیا میں شرکت اختیار کی ہے۔ قانونِ ضرورت کے تحت اس نے مافیا کے گاڈ فادر سے سرٹیفکیٹ بھی حاصل کیا ہے۔ ماہِ نو میں چھپوایا ہے۔ لہٰذا اب انور سدید کا پیش لفظ بتقاضائے ضرورت اخراج کا حق دار تھا۔ بھلا کیوں قلم زد نہ ہوتا۔ اس ترقی یابی پر سلیم اختر کو مبارکباد نہ دو تو ناسپاسی ہوگی۔ کبھی تم میں ان میں بھی راہ تھی۔ ذرا دریافت کرو کہ اس کا وہ مقالہ جس پر جامعہ پنجاب نے ڈگری عطا کی۔ اب اشاعت کے کس مرحلے میں ہے اور جوام مانع نہ ہو تو میں اس ضمن میں میری ایک رباعی سنو: ـــ

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے — کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے، اللہ اللہ — وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

دیکھو! یہ صورت واقعہ کا بیان ہے پر جو تم نے ایسی شوخی کہیں نہیں دیکھی ہوگی۔ یہ بالکل نئی بات ہے اور میرا حصہ ہے۔ مطلب یہ کہ ہم ہر چند مافیا کے گاڈ فادر کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ مگر وہ ہماری کام روائی میں درنگ ولیت ولعل کرتے ہیں۔ پھر دل میں خیال آتا ہے کیا گاڈ فادر کو معلوم نہیں کہ آشنائی ہماری وزیر آغا سے تھی ـــ اظہر جاوید سے تھی۔ غلام الثقلین نقوی سے تھی۔ ان سب سے وفا نہیں تو گاڈ فادر سے کیوں؟ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا سے ہی کہیں، پھر دل میں خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو۔ وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں۔ صبح و شام کرنا لیت ولعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ شام کو صبح کرنا اور صبح کو شام کرنا خدا کا کام ہے۔ تو خدا کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ صبح و شام کرنے والے ہیں۔ میاں بتاؤ، اس وضاحت پر تم مسکرائے کیوں؟ میرے مدرسانہ لہجے پر؟ سنو! یہ میرا اسلوب خاص نہیں، صرف تمہیں سمجھانے کے لیے اختیار کیا ہے۔

سنا ہے کہ وزیر آغا کی نظم آدھی صدی کے بعد چھپ گئی ہے۔ غلام جیلانی اصغر نے اس پر ایک تبصرہ بزبان انگریزی پاکستان ٹائمز میں چھپوایا۔ گوپی چند نارنگ نے تعریف کی۔ اور فرمایا کہ اس نظم میں لمحات کی باز آفرینی بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔ اور زندگی کی مسافتوں کے اڑتے ہوئے رنگوں کو اظہار کی ندرت سے گرفت میں لیا ہے۔ اس نظم کا حُسن اس کی دلآویز تخلیقیت اور لطیف امیجری میں ہے جسے وزیر آغا بے ساختہ بنتے چلے گئے ہیں"۔ اس کتاب پر گفت گو کی ایک محفل کشور ناہید نے اپنے مکان پر سجائی اور شرکت اس میں غالب احمد، جیلانی کامران، سجاد باقر رضوی، جاوید شاہین نے کی، سنا ہے کہ گفت گو سب لوگوں نے کی، لیکن چھپاٹ صرف کشور ناہید کی سنائی دی۔ ادب لطیف میں یہ گفتگو شائع ہو گی۔ نواب زین العابدین عارف سے پڑھوا کر سنوں گا۔

لو دیکھو، مجلّہ فنون میں محبِ گرامی احمد ندیم قاسمی نے فروغِ دشنام کی مہم کو پھر ہوا دی ہے۔ تیر اندازی کا ہدف کون ہے؟ تمھیں کچھ پتہ چلے تو مجھے لکھو کہ روئے سخن کس جانب ہے؟ میں نے انور سدید سے پوچھا۔ مولانا نعیم صدیقی سے دریافت کیا۔ دونوں اصحاب فرماتے ہیں: "وہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا" یقین بالیقین کہ انور سدید اس کا جواب ضرور لکھے گا۔ محبِ گرامی احمد ندیم قاسمی جز بز ہوں گے۔ مولانا مہر دریافت کرتے ہیں کہ یہ امتیاز علی خاں (شارجہ) جو بہرۂ اختلافات میں مکتوب نگاری کرتے ہیں کون بزرگ ہیں۔ یہ نام پہلے ادب میں سنا نہیں۔ اللہ اللہ نطق کو آفریدگار نے کیا پایہ اور کیا سرمایہ دیا ہے۔ مسائل حکیمانہ کی ہستی، خیال ندیمانہ کی مستی، درد و درماں کے مدارج کا اظہار، افسانہ و افسوں کے مقاصد کا مدار، یہ دریافت ہے یا تخلیقِ مدیر؟ ایک دفعہ شریف الدین اشرف کی ہاہاکار بعینہٖ مچی تھی۔ انور محمود خالد نے اسم شماری چنیوٹ کے قریبے میں کی اور کہا کہ اس نام کا کوئی ذی رُوح اس قریبے میں موجود نہیں۔ اس وقت سے یہ حضرت غائب ہیں۔ اب نمود امتیاز علی خاں کی ہوئی ہے لیکن شکوہ شکایت کا عنوان وہی۔ تعریف و تحسین کا انداز یکساں نفرین و آفرین کا بیان ویسا۔ حکام شارجہ کہتے ہیں کہ اس نام کا شناختی کارڈ شارجہ کے دفتر امورِ داخلہ سے تا حال جاری

نہیں ہوا۔ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ جو تم عدم سے تاحال عالمِ وجود میں نہیں آیا وہ رسالہ فنون میں کیسے در آیا ہے؟ تم ایک ادبی مجلّے کے مدیر اعزازی اور عذرا اصغر مدیرہ اعلیٰ ہیں، بتاؤ کہ تم اپنی انجمنِ خیال بھی اس قسم کے جعلی خطوط سے آراستہ کرتے ہو اور نہیں تو کیوں؟

اے بھائی! جو تم پرویز بزمی کو غزل سے اجتناب کا مشورہ دو تو تمہاری مرضی لیکن زنہار خطوط نگاری سے منع نہ کیجیو۔ "تخلیق" میں اس نے معرکہ کا خط لکھا ہے۔ غالبِ خستہ حیرت زدہ ہے

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی۔

ضرب اس کی شدید، وار اس کا کاری، یہ تیغِ تیز غزل میں بھلا چل سکتی ہے؟

حضرت جعفر شیرازی قریۂ مجید امجد میں کہ سابق اسم اس شہر کا منٹگمری ہے اور اب ساہیوال موسوم ہوتا ہے۔ عذرا اصغر کی کتاب کی تقریب منعقد کریں تو مجھے بلانا نہ بھولیں۔ میں قصہ کہانی کی ذوق بخشی و نشاط انگیزی کا دل سے قائل ہوں اور عذرا اصغر کی حکایات ممتنع الوقوع نہیں۔ یوں تصوّر کرو کہ قلمروِ اُردو میں ایک قصرِ دلکشا یا ایک خانہ باغِ روح سر تا سر بنایا۔ گویا تحریر کو پیرایۂ تقریر اور تقریر کو حسنِ تصویر دیا ہے۔ واہ وا - !

سنا ہے کہ راغب شکیب کو ایک بنتِ کراچی نے لوٹ لیا ہے۔ عجب حادثہ ہے کہ ابن کراچی تمہارے درپئے آزار اور بنت کراچی ... راغب کے اعصاب پر سوار اللہ اللہ۔

"یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ——— " ومن اللہ التوفیق و ھو خیر الموفیق۔"

لو بس! اب میں عبدالحمید عدم سے باتیں کر رہا ہوں۔ تمہارے خط کے جواب نے اتنی دیر تک ان کو چپکا بٹھا رکھا۔ پرورے حضرت بھی بے کار نہیں بیٹھے، میں نے تمہیں خط لکھا، عدم نے ایک اور دیوان غزلیاتِ تازہ مرتب کر لیا۔ حضرت تم کو اور عذرا اصغر کو سلام اشتیاق پہنچاتے ہیں۔ نیز کہتے ہیں کہ اسرار زیدی کو ان کا پیغام پہنچا دو۔ وہ جو کتاب ان کی شاعری کے باب میں مرتب کر رہے ہیں۔ اس میں کتابت کی اغلاط اور اشعار کی تکرار ہرگز نہ ہو۔ ہائے خدا کی مار کاتبانِ ناہنجار پر، میرا دیوان اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز ستیاناس کر کے چھوڑ دیا۔ نصرۃ ادیب ہاشمی کا تعزیت نامہ میں نے امروز میں پڑھا۔ عبدالحمید

عدم نے آنکھوں سے لگایا۔ تم اس عزیزہ سے ملو تو شکریہ ادا کرو! اور امروز و تخلیق میں اس کی سرپرستی کرو۔ کلام اس کا چھاپو — پروین عاطف کو میرا اسلام سابقہ پہنچایا تھا؟ نہیں تو اب پہنچا دو! کہو میں اس کے سفرنامے کا مدّاح ہوں!

۲۳ر اپریل ۱۹۸۱ عیسوی
بروز جمعرات

رحم و کرم کا طالب
غالبؔ

۱۴

میاں!

آج یک شنبہ کا دن، گیارھویں جولائی (۱۹۸۱ء) کی اور شاید آٹھویں رمضان المبارک (۱۴۰۱ھ) کی ہے۔ دوپہر کے وقت حمید احمد خاں جو رہنے والے کرم آباد ضلع گوجرانوالہ کے ہیں اور عرصہ دراز تک خطّۂ لاہور میں طلبہ کو اسرار و معانیِ غالب بتانے پر مامور رہ چکے ہیں میرے پاس تشریف فرما ہوئے۔ تمھارے اور عذرا اصغر کے خطوط جو لکھے ہوئے ۱۴؍ شعبان المعظم کے ہیں دیے۔ دونوں کا سوادِ خط ایک، مضمون ایک، موضوع ایک لیکن طریقِ اظہار جدا۔ اسلوبِ بیان الگ، میں نے دونوں کو بگوشِ ہوش سنا۔ بچشمِ نم دیکھا اور خوش ہوا کہ پاکستان میں میرے کیسے کیسے مربّی، محسن اور دوست بستے ہیں۔ داستانوں کے تحفے، شعروں کے نذرانے، محبّتوں کے گلدستے ارسال کرتے ہیں۔ یہ خط نگاری نہیں۔ کبھی مفاوضہ، کبھی مفاکہہ، کبھی مفاغمہ۔ اور جو کبھی خط میں تعویق یا تاخیر ہو تو دل کھنچتا ہے۔

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

بھائی، یہ شعر میں نے بلاوجہ اقتباس نہیں کیا۔ احوال آنکہ، تمھارا سابقہ خط ڈاک سے
مجھے نہیں پہنچا۔ اور نہ میں شہر سے کہیں گیا۔ جہاں رہتا تھا وہیں ہوں، خدا جانے وہ خط کیوں
مسترد ہوا۔ بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ تمھارا خط آوے اور میں پھیروں؟ تم خود کہتے ہو کہ اس پر
یہ لکھا ہوا آیا کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں ہے۔ میں ہوتا اور یہ لکھتا کہ یہاں نہیں ہوں؟ آگرہ،
الور، سرگودھا، لاہور اور اسلام آباد سے برابر خط آرہے ہیں۔ ذکر ان میں میرے مکتوب کا
ہے جو تم نے اور عذرا اصغر نے مجلہ تخلیق کی اشاعتِ گزشتہ میں شایع کیا۔ نقصان مایہ الگ
کیا۔ شماتتِ ہمسایہ علیحدہ اٹھائی۔ لیکن اس ذکر کی بازیافت سے باز نہ آئے جو رودِ راوی
کے ساحل امروہہ سے ٹکرانے سے پیدا ہوئی تھی۔ اب سنا ہے کہ رودِ راوی تو مائل بہ سکون ہے
لیکن جو طغیان اخبار حرّیت میں اٹھا تھا اس کی زد مزید نقادِ زماں محمّد علی صدیقی پر پڑی ہے۔
اِدھر ان کی کتاب "نشانات" چھپی، اُدھر انھیں نوکری سے فراغت ملی، حیران ہوں کہ
اشاعتِ کتاب پر مبارکباد پیش کروں یا حصول فراغت پر، فی الحال اس مسئلے کو التوا
میں ڈالتا ہوں کہ مجھے "نشانات" کا نسخہ زیر دستخطی مصنّف نہیں ملا۔ ملا تو اس پر غور کروں گا۔
تم مجھے بتاؤ کہ اس افراتفری میں کہ دوست اور آشنا آشنا نہیں رہا حضرت نصراللہ خاں
امرتسری پر کیا گزری، اور جو شیر ابھی تک حرّیت کے جال میں ہو تو لکھو! مزید کیا منظر امکانی کی
کالم نگاری اخبار میں چل رہی ہے یا وہ پرِ کاہ بھی موجِ تیز میں بہ گیا ہے۔

اے میاں۔ ملازمت سرکاری ہو یا ساہوکاری کی مالک کی مرضی کے ساتھ مشروط ہے اور
جو اس سے روگردانی ہو تو بیک بینی دو گوش ملازمت بدر، پھر کیا ہے؟

"رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رکھیو"!

میں نے اس کا ذائقہ کم کم چکھا ہے۔ ایک دفعہ موقعہ ملازمت سرکار انگلسی کا پیدا ہوا
تھا لیکن اس کو ذریعۂ عزّت نہ جانا۔ سو یہ خدمت امام بخش صہبائی کو سونپ سجدۂ شکر
بجالایا۔ ابوظفر سراج الدّین کی خدمت کی بات الگ ہے۔ وہ نوکری نہیں خدمت بالواسطہ
ادب تھی، اور جو حضور کے جاہ و جلال اور شوکت و افتخار کا آفتاب چندے قائم رہتا اور
تاریخ تیموری بعنوان "پرتوستان" تکمیل کو پہنچتی تم دیکھتے کہ غالب کے نام کے ساتھ آلِ تیمور

کے جاہ وجلال وجمال کو بھی دوامِ ابد حاصل ہوتا۔ غالب کی تاریخ نگاری دوستوں کی خوشنودیِ طبع کا وسیلہ نہیں بلکہ کمالاتِ فن کی نمائش کا ایک متداول ذریعہ ہے۔ سو اس کا موقعہ معدوم!

سید جعفر شیرازی نے جو تقریبِ جمیل عذرا اصغر کی تصنیف الموسوم بہ "پت جھڑ کا آخری پتہ" پر بمقام ساہیوال منعقد کی تھی۔ بے شک میں نے اس میں شرکت کا وعدہ کر رکھا تھا۔ تم پوچھو گے پاؤں سے اپاہج، ضعفِ بصارت، ضعفِ دماغ، ضعفِ دل، ضعفِ معدہ ان سب ضعفوں پر ضعفِ طالع —— پھر یہ وعدہ کیوں؟ میں کہوں گا کہ سید شیرازی کے مرقعِ گلگوں نے سیر کی بہار دکھلائی، بہ سواری ریل روانہ ہونے کی لہول میں آئی۔ قصد سفر کیا۔ لیکن ناچار! سنا ہے کہ ایک جلوسِ جہاں میرے استقبال کو اسٹیشن پر موجود تھا، میں نہ پہنچا تو حضرت جعفر شیرازی بہت ملول ہوئے۔ لوگ دریافت کرتے تھے کہ عذرا اصغر کی داستانوں کا مدّاح غالبِ نکتہ داں کہاں ہے اور سید صاحب نے اپنے ہونٹوں پر ایک مرجھائی ہوئی موجِ تبسم یوں آویزاں کر لی تھی جیسے اپنا جواب آپ ہوں۔ ناگاہ جانبِ لاہور سے ایک گاڑی آئی، اس میں سے کون اترے۔ داستان نگار عذرا اصغر اور نواب اصغر مہدی اور میرزا اظہر جاوید۔ سفید آفتابوں جیسے اُجلے قہقہے فضا میں بکھرے۔ بارے سید جعفر شیرازی کے ہونٹوں سے موجِ رائیگاں چھٹی اور وہ اس جلوسِ نگاراں کو لے کر جانبِ شہر روانہ ہوا۔ ایم اے اشرف نے روداد اس جلسے کی اخبار امروز میں لکھی۔ تم نے مزید زیبائی پیدا کی۔ ساتھ اس روداد کے عذرا اصغر کی تصویر شائع کی۔ وہی وضع رو، وہی قطعِ مو، وہی ہو بہو —— مجھے یہ پرچہ ملا تھا۔ میں نے نواب زین العابدین عارف سے پڑھوا کر سنا۔ دل خوش ہوا۔ سبحان اللہ۔

خطۂ ملتان میں ایک نخلستان "الشمس" کے اسم سے موسوم ہے۔ آبیاری اس نخلستان کی حضرت عاصی کرنالی اور ان کی بیگم ثریا نو ہاشمی کرتی ہیں۔ میاں شاعرِ غزل، افسانہ نگارِ جہاں، مدحت گوئے رسول، بیوی ناول نگار، نکتہ داں، انجمن آرائی دونوں کی ضرب المثل ہے۔ ایک انجمن بعنوان "حریمِ فن" انھیں کی بنا کردہ ہے۔ طریق اس کا یہ ہے کہ مرد وزن

دونوں اس میں شرکت کرتے ہیں۔ مرد مقالہ نگار ہوں تو سامعین طبقۂ اناث پر مشتمل، اور جو خواتین اپنی تخلیقات کی رونمائی کریں تو مردوں کو رائے دینے کی صلائے عام۔ ماہِ گزشتہ محبِ محترم طفیل ہوشیار پوری کو حریم فن نے بطور خاص مدعو کیا۔ کلماتِ تحسین پیش کرنے والوں میں ثمر بانو ہاشمی، بیگم عرفان اور ڈاکٹر صفیہ بانو پیش پیش تھیں، شرکت اس محفل میں طفیل ہوشیار پوری کے لیے مثل حبِ جواہر ثابت ہوئی۔ سنا ہے کہ صحت ان کی اب پہلے سے بہتر ہوگئی ہے۔ آشوب چشم میں افاقہ ہوا ہے۔ عاصی کرنالی میرا مونس، میرا دم ساز، میرا ہمدم ہے۔ سینکڑوں اشعار غالب اس کے حافظے کی لوح پر کندہ ہیں۔ بے ضرورت انھیں اقتباس کرتا ہے۔ گویا فروغِ غالب میں بالواسطہ معاونت کرتا ہے۔ میں نے اسے متوجہ کرایا ہے کہ حریم فن میں ایک محفل داستاں نگاروں کی منعقد کرے اور اس میں عذرا اصغر کو بلائے اور جو محفل غزل نگاروں کی ہو اس میں اظہر جاوید کو طلب کرے۔ دیکھئے کیا جواب آتا ہے۔ ہاں اے بی اشرف نے اردو اکادمی سے فراغت شتابی سے حاصل کی۔ ایک محفل افسانہ، ایک شام تنقید، ایک مجلسِ نظم منعقد کی۔ دساور سے کسی شاعر، نقاد، افسانہ نگار کو نہیں بلایا۔ مرزا حنیف، عرش صدیقی اور انوار احمد سے کام چلایا۔ بھلا فروغِ ادب کا یہ بھی کوئی انداز ہے؟ اور نہیں تو لاہور سے تحسین فراقی کو بلاتا۔ افضل آرٹس کو دعوت دیتا۔ بیدار سرمدی کو مدعو کرتا۔ محفل کی رونق بڑھتی، اخبارات میں ذکر ہوتا۔

سنا ہے کہ میرزا ادیب کی اہلیہ محترمہ نے قید حیات سے نجات حاصل کرلی۔ میرزا صاحب نے سوئم تک گہرا غم کھینچا۔ اس کے بعد بساطِ غم سمیٹی اور کالم نگاری کا شغل دوبارہ اختیار کیا کہ غم کٹے، دکھ مٹے۔ اے میاں، چالیس پچاس برس کے رفیق کا چھننا کوئی معمولی بات ہے؟ شراب وہ نہیں پیتے، گنجفے کا انھیں شوق نہیں، محفل آرائی سے وہ گریزاں۔ کالم نہ لکھیں گے تو اور کیا کریں گے؟ اس پہاڑ ایسے غم کو کیسے کاٹیں گے؟ میرزا ادیب سے ہمدردی بجا لیکن اس

عفیفہ کا حوصلہ بھی تو دیکھو جس نے پچاس برس تک میرزا صاحب کے ساتھ نباہ کیا۔ ان کی صحرا نوردیوں کو قبول کیا۔ ان کے شوقِ تصنیف و تالیف کو گوارا کیا۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو زادِ حیات سمیٹے بغیر دنیا سے منہ موڑ لیا۔ فریدہ میرزا کا کیا حال ہوگا۔ سوچتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اے بھائی میرزا صاحب کو کالم نگاری میں مصروف رکھو۔ حیدر قریشی آمادۂ شر ہے۔ اور انھیں حقیقی صحرا کے مشاہدے کے لیے چولستان کی سیر کی دعوت دے رہا ہے۔ صحرا نورد کے خطوط لکھنے کے بعد بھلا مشاہدۂ صحرا کی ضرورت باقی ہے؟

اگلے روز سید وقار عظیم نے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا۔ پاس ان کے جریدہ ماہِ نو تھا۔ کہنے لگے کہ موجِ دشنام جو رسالہ "فنون" سے اٹھی تھی اب جریدہ ماہِ نو تک آ گئی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اشارہ دزد نگار سحر پرست طاہر تونسوی کے مضمون کی طرف ہے۔ جو اس عزیز نے خلاصۃ التواریخ مؤلفہ سلیم اختر کے دفاع میں اس جریدے میں چھپوایا ہے۔ اور جس میں اقتباساتِ مذمومہ سے ڈاکٹر وزیر آغا، سلیم احمد اور انور سدید پر دشنام طرازی کی ہے۔ میں عرض پرداز ہوا ــ "بلاشبہ طرح اس آشکار عالم جریدے کی آپ نے ڈالی۔ مضامین نو سے آراستہ کیا۔ ادب اور ادیب دونوں کو عزت و آبرو عطا کی لیکن اب زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے۔ جن لوگوں کا تکیہ دزد نگاری پر ہے وہ ادب کے سرخیل ہیں۔ جو لوگ اپنی دکانِ ادب متاعِ غیر سے سجاتے ہیں۔ ان کے اعمالِ شنیعہ کا ذکر بے معنی ہے۔ سید صاحب بولے "میرزا، ماہِ نو سرکار پاکستان کا رسالہ ہے۔ اس کا منصب یہ نہیں کہ پست سیاسیات اور ارذل ذاتیات سے آلودہ ہو اور فنون کی سطح پر اتر آئے۔ اسے جو توقیر حسن عسکری نے اور رفیق خاور نے اور ظفر قریشی نے اور فضلِ قدیر نے دی تھی کشور ناہید نے اس میں اضافہ کیا۔ ہر طبقۂ خیال میں ماہِ نو کے لیے جائے عزت پیدا کی، اب یہ توقیر مجروح ہو رہی ہے تو بھلا کیوں ملال نہ ہو۔ سید صاحب کے چہرے سے غم اور آنکھوں سے

کرب عیاں تھا۔ میں نے سنا تو خاموش ہو گیا۔ وجہ یہ کہ اب

نہ انشا معنیِ مضموں، نہ املا صورتِ مضموں

عنایت نامہ ہائے اہلِ دنیا ہرزہ عنواں ہیں

بھلا بوجھو اشارہ طاہر تونسوی کی طرف ہے جس کی درزنگاری کا چرچا اب خلدآباد میں بھی پہنچ چکا ہے۔

میاں، اشاعت اس مضمون کی ماہ نو میں بے محل نہیں۔ خلاصۃ التواریخ مؤلفہ سلیم اختر پر جو تنقید لطیف ایک مردِ مبارز نے اخبار مشرق میں لکھی ہے اس سے حضرت کی تاریخ نگاری کی قلعی کھل گئی ہے۔ جو تنقید مقاصد کی غلام ہو اس کا حشر اور کیا ہو گا۔ اب صاحب موصوف لٹی ساکھ کو بحال کرنے کے لیے جلی ہوئی رسی کے بل گننے میں مصروف ہیں، درزنگاروں سے اپنی توصیف کراتے ہیں، کہتے ہیں جس روز اخبار مشرق میں متذکرہ تنقیدِ سدید چھپی اس روز خلاصۃ التواریخ کی دس کاپیاں زیادہ بکیں۔ جس کسی کی تالیف تحفتہً موصول ہو اسے لکھتے ہیں کہ آپ کا ذکر اگلے ایڈیشن میں کروں گا اور جو پوچھو پچھلے ایڈیشن میں کیوں ذکر نہیں تو جواب ندارد، اہلِ ادب ہنستے ہیں:

"کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد"

لطیفہ ــــ ایک غزل گو شاعر نے دریافت کیا: "آپ نے میرا ذکر زمرۂ شعرا میں نہیں کیا؟" پروفیسر صاحب نے پوچھا: "بھلا آپ کے پاس میری تاریخ کا کونسا ایڈیشن ہے؟" جواب ملا "دوسرا"! تاریخ نگار موصوف نے ہنس کر جواب دیا "حضرت آپ سے تو ملاقات پانچویں ایڈیشن کے بعد ہوئی تھی۔ بھلا دوسرے ایڈیشن میں ذکر کیوں کر آتا۔؟ چھٹا ایڈیشن دیکھئے۔ آپ کا ذکر خطۂ ملتان کے شعرا میں موجود ہے۔

اے بھائی۔ بظاہر یہاں لطیفہ ختم ہو جاتا ہے لیکن ہنسی کو محرک نہیں کرتا۔ اب واقعہ سنو! ساتویں ایڈیشن پر سلیم اختر کے تعلقات اس شاعر سے بگڑ گئے۔ لہٰذا اس اشاعت پر حضرت خلاصۃ التواریخ سے بیک بینی و دو گوش خارج ــ اللہ باقی ہوس،

اے بھائی اظہر جاوید! سلیم اختر کے ساتھ کبھی تمہاری بھی گاڑھی چھنتی تھی، تم نے اسی کالم

اخبار امروز میں لکھے، اس نے اپنی مقراضِ تیز کا ایک کرشمہ فکرِ اقبال کے منور گوشے "اظہر جاوید اور تخلیق کے نام معنون کیا اور اقبال کا یہ مصرع بے محل اقتباس کیا

"عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں"

گویا یہ شررِ عطائے خسروانہ پروفیسر سلیم اختر کی ہے۔ مجھے لکھو کہ تمھارا ذکر کس ایڈیشن سے موقوف ہوا؟

حضرت مشفق خواجہ نے مجھے اب تک جو کتاب کراچی سے مرحمت فرمائی ہے اس کا موضوع بالواسطہ صفیر بلگرامی اور بلاواسطہ غالب دہلوی ہے۔ اے بھائی، میں نے تو "تخلیقِ ادب" میں ایک گوشہ کی مثل گوشۂ یگانہ کے درخواست کی تھی۔ خواجہ موصوف نے پوری کتاب کا موضوع تلاش کر لیا۔ سبحان اللہ! الحمدللہ۔ میں خوش ہوا کہ خواجہ صاحب حضور نے سیّدی وسندی، نورِ بصر ولختِ جگر۔ قرۃ العین اسد مولوی سیّد احمد صفیر بلگرامی کا جس کے طولِ عمر و دولت دوام و بقائے اقبال کی میں نے دعائیں مانگی ہیں۔ ذکر اس رسالہ میں بہ تفصیل کیا، موصوف رئیسِ جلیل القدر عظیم آباد و آرہ اور حضرت فلک رفعت مولوی سید صاحب عالم مارہروی کے نواسے ہیں۔ سید ہیں۔ واسطی ہیں۔ بلگرامی ہیں۔ بلگرامی سادات علم وفضل میں نامی اور قدر و منزلت میں گرامی ہیں۔ میں نے ایک تقریظ ان کی تالیفِ لطیف رسالۂ تذکیر و تانیث" پر لکھی تھی اور وہ یوں کہ حضرت کی مدّاحی میں گویا اپنی ثناخوانی کی۔ ایک دفعہ موسم گرما میں بہرِ ملاقات دلّی بلّی ماروں کے محلّے میں غریب خانہ پر تشریف لائے۔ ایک ٹوکرا ثمرِ شیریں کے ہمراہ۔ نصف ٹوکرا اندرونِ خانہ بھجوایا اور نصف دیوان خانہ میں احباب میں تقسیم کرنے کے لیے اپنے پاس رکھا۔ میں نے آم چکھے تو رس دار، شیریں، لطیف، لذیذ، اے میاں، میں تو نصف ٹوکرے پر قناعت نہ کر سکا۔ ایک رباعی فی البدیہہ برزۂ کاغذ پر لکھی اور سیّد موصوف کو بھجوائی۔ انھوں نے بقیہ نصف ٹوکرا بھی اندرونِ خانہ بھجوا دیا۔ میں یہ واقعہ بھول گیا تھا۔ مشفق خواجہ نے تحقیق سے اس کا کھوج نکالا۔ اور کتاب میں درج کیا۔ اب تم مشتاق کہ میں رباعی پیشِ خدمت کروں۔ نسیان کے باعث مجھے سب کچھ بھول گیا ہے۔ ہاں مشفق خواجہ نے بہ اعانت صفیر بلگرامی ایک

مصرع لکھا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ کلیان نے بتایا۔ دیوان خانے میں صفیر بلگرامی احباب کے ساتھ آم کھانے پر مائل ہیں۔ ہاتفِ غیب نے لکھوایا ــــــ

"کھانا نہ انھیں پرائے ہیں یہ آم"

باقی تین مصرعے یاد نہیں۔

دہلی میں ان کا قیام میرے لیے راحتِ جان تھا۔ خواجہ امان مصنّف "بوستانِ خیال" اور مولوی صدرالدین آزردہ اور نواب ضیاء الدین خاں سب سے ملاقات کی۔ جامع مسجد دیکھی تو سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ اٹھے۔ تبرّکات کی زیارت کی تو سجدۂ تعظیمی بجالائے۔ ایک روز حضرت میرے عزیزوں کے ساتھ بگھی پر بیٹھ کر پنکھے کا میلا دیکھنے گئے، میں نے عزیزداری کی ذیل میں دس روپے دیے، کورنش بجا کر قبول کیے اور واپس آئے تو اس سیرِ خود اختیاری پر شاداں و فرحاں۔ میرا ان سے خط و کتابت کا تعلق بھی تھا۔ میرے تمام خطوط صفیر کی آنکھوں کے سامنے شائع ہوئے۔ میں نے تقریظ "رسالہ تذکیر و تانیث" عودِ ہندی میں شریک کی، موصوف نے ایک غزل میری زمین میں کہی:

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا　　　ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

میں نے دریافت کیا۔ کیوں حضرت! "ابھی کچھ کی تحتانی کا دبنا کیا غیر فصیح نہیں ہے"؟ جواباً فرمایا کہ زبان دانانِ لکھنؤ کے یہاں عام حروفِ علّت آخر لفظ بندی کا گرانا جائز ہے اور غیر زبان کے لفظ کا ناجائز۔ مخصوص حروف علّت میں الف اور یائے تحتانی پر تو ہمیشہ مار رہی ہے۔ ہاں فصحا بہ ضرورت اور حسبِ موقع دباتے ہیں۔" اور تو اور حضرت نے مجھے بھی نہیں بخشا اور لکھا

"دہلی بھی اس سے خالی نہیں خیال آتا ہے کہ یہ مطلع حضور کا ہے۔

دیوان آپ کا اس وقت موجود نہیں:

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا!

بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا۔

"بھی تو ویراں" فعلاتن کے وزن پر ہے۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں۔

فی الحقیقت خلاف ہے۔ مگر یہ قواعد ابھی تک مخصوص فارسی و عربی ہیں۔
اُردو میں نہ تھے۔ نہ ہیں اور نہ ہوں گے!"

میں نے پڑھا تو خوش ہوا کہ عزیز موصوف وقوف رکھتا ہے اور اختلاف بے سلیقہ نہیں کرتا، میں نے جواب الجواب لکھا

"ابھی کچھ بات کرنہیں آتی" کا جواب باصواب پایا۔
تم سلامت رہو قیامت تک   صحت و زورِ طبع روز افزوں
مگر ایسی باتوں سے بچنا مناسب ہے گو بھی سے ہو۔ شاعر پابند قواعد ہیں، کچھ قواعد حسبِ خواہش شاعر نہیں۔"

میاں، یہ واقعہ میں نے بلاوجہ اقتباس نہیں کیا۔ مقصود یہ ہے کہ تم نے جو تحریر تاج سعید کے گیت پر پادرق میں درج کی ہے وہ نامناسب نہیں۔ مزید یہ بتاؤ کہ اگر میں یوں اختلاف سلیم اختر سے کرتا تو کیا وہ بھی اسے خندہ پیشانی سے قبول کرتا؟ ہائے ہائے، اپنے زمانے کی دلّی اور اس زمانے کے لوگ یاد آتے ہیں۔ "جلوۂ خضر" جلد اوّل کے جلوۂ پنجم میں میرے باب میں صفیر بلگرامی نے لکھا۔

"میرے نزدیک ہندوستان کے کلام فارسی پر ولایتی فارسی کا یقین چار شخصیتوں کے کلام پر ہوا۔ اوّل۔ امیر خسرو، دوم۔ حسن دہلوی، سوم۔ میرزا بیدل، چہارم۔ غالب۔ اگرچہ ناصر علی سہرندی اور مرزا جانجاں مظہر اور غنی کشمیری اور غنیمت اور خانِ آرزو۔ اور آزاد بلگرامی، اور میر امامی بلگرامی اور امام بخش صہبائی اور شاہ الفت حسین فریاد یہ سب کے سب خوش گوار اور شاعرِ بے بدل مگر جامۂ ایجاد جو خداداد ہے انہی چاروں کے راست قامت راست آیا۔۔۔۔ ہندوستان کی فارسی کا کہ شمس الدین فقیر دہلوی کے وقت سے ایک طرزِ خاص سلامت آمیز شروع ہوا تھا۔ رنگ ہی بدل دیا اور بڑی ہمت کر کے فارسی کو پھر ولایت کی کرسی پر بٹھایا۔"

اور بعدہٗ بیے اختلاف بھی اس موقف سے سرِمو انحراف نہیں کیا۔ اور جب اپنے استاد دوں

سے منحرف ہو جانے والے شعرا کو مطعون کرنے کے لیے "محشرستانِ خیال" لکھی تو اس کا مرکزی کردار غالب ہی کو بنایا۔ "میدانِ تصور" میں جو مشاعرہ اور جلسہ ہوتا ہے وہ غالب کے خیمے میں ہی ہوتا ہے۔ گویا غالب میرِ مجلس ہے اور ایشیا اور یورپ کے شعرا اس کے سامنے شعر سرا ہیں، اب بھلا ایسے تلامیذ زمانے میں کہاں ہیں اور خطۂ لاہور تو الٹا اُستاد کے درپے ہے۔ کہتا ہے۔ لا ــــ اور ــ "ھل من مزید" ــــ

بھائی، یہ سب احوال مشفق خواجہ نے اپنی کتاب متذکرہ میں لکھے ہیں، میں اپنی لوحِ دماغ سے ان کی تائید کرتا ہوں، مشفق خواجہ نے سب کچھ مستند ذرائع سے حاصل کیا اور بلا کم و کاست لکھا۔ میں اس کی تصدیقِ مزید کرتا ہوں اور لکھتا ہوں کہ مؤلف و محقق مشفق خواجہ کا شہرۂ تحقیق تا روز شمار رہے گا۔

اگلے روز الطاف مشہدی کا ورود مسعود خلد آباد میں ہوا۔ پذیرائی ان کی اختر شیرانی نے اور عبدالحمید عدم نے اور ہری چند اختر نے اور منظور احمد منظور نے کی۔ عرق انگلیسہ کی طلب میں غریب خانے پر بھی تشریف لائے۔ بیگم عنادل ہمراہ تھیں۔ مگر صورت یہ کہ آنکھوں کو سیاہ چشمے میں مستور کر رکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ ارضِ لاہور پر ایک مرض متعدی کہ آشوبِ چشم کہلاتا ہے اِن دنوں تازہ وارد ہے۔ الطاف مشہدی نے حفظِ ماتقدم کیا کہ یہ مرض خلد آباد میں منتقل نہ ہو۔ میں نے یہ بیان سنا تو ہنسا اور دریافت کیا کہ لاہور آشوبِ چشم میں بھلا کب مبتلا نہیں رہا۔ یہ بیماری اس شہر میں دیرینہ ہے۔ ہر شخص اس میں مبتلا ہے۔ تم نے رسالہ "مفاہیم" میں سلیم اختر کا وہ مکتوب پڑھا ہے جس میں واویلا کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے پاکستان کے افسانے میں احمد ندیم قاسمی کا ذکر نہیں کیا۔ اے بھائی، کیا ہر مضمون میں احمد ندیم قاسمی کا ذکر وزیر آغا کا فرضِ عین ہے؟ کوئی موقع ہونا چاہیے، کوئی محل ہونا چاہیے اور جو ضروری ہوتا تو وزیر آغا بھلا دانستہ اس سے پہلو تہی کیوں کرتے؟ وضاحت کے طور پر مدیر "مفاہیم" سرور عثمانی نے سلیم اختر کی توجہ صفحہ ۲۳۹ سطر ۸ کی طرف مبذول کرائی ہے جہاں احمد ندیم قاسمی کا ذکر موجود ہے۔ اے بھائی، یہ آشوبِ چشم نہیں تو کیا ہے۔ پاکستان

اور ہندوستان میں اگر علمی وقار وزیر آغا کی تحریر کو حاصل نہیں تو پھر علمی وقار کس چڑیا کو کہتے ہیں ؟ اس کی تعریف کیا ہے ۔ کیا اس کی تعریف پر سلیم اختر پورا اترتا ہے "جو تخلیق کے آسمان سے گر کر پلک" اور "فنون" کی کھجور میں اٹک گیا ہے ۔ تم اسے ترقیِ معکوس نہ کہو گے ؟

عبد الحمید عدم اور الطاف مشہدی پر تم نے جو تحریریں "محفل محفل" میں شائع کی ہیں ان کا یہاں بہت چرچا ہے ۔ دونوں حضرات خوش تھے کہ اظہر جاوید نے ہمیں یاد کیا ۔ گویا حیاتِ نو دی ، اسرار زیدی کی کتاب اب کس منزل میں ہے ؟ اور جو خلد آباد سے انہیں ایک مضمون الطاف حسین حالی اور دوسرا نیاز فتح پوری کا بھجواؤں تو کیا شریکِ اشاعت کریں گے ۔ خالد احمد کے گھر میں دختر کی ولادت کی خبر مجھ ہو چکی ہے ۔ کچھ عرصے سے روشس ع . یز کی مائل بہ سنجیدگی ہے ۔ یہ دختر فرخندہ اختر ہے ۔ اب جو ان سے ملو تو میرا اسلام کہہ کر ان کی خیریت دریافت کرو ۔ سنا ہے کہ تم نے خاکہ نگاری میں اپنی راہ الگ تراشی ہے ۔ لیکن ذکر اس کا انور سدید نے جائزہ ۱۹۸۰ء میں نہیں کیا ۔ یہ سہو بالا رادہ تو نہیں ؟ لیکن زینہار خاکہ نگاری سے کنارہ کشی ہر گز اختیار نہ کرنا ، تم مردم دیدہ بھی ہو اور مردم گزیدہ بھی ، بات حد ادب میں رہ کر کرتے ہو لیکن تیر تمہارا دل میں ترازو ہو جاتا ہے ۔ یہ سب کچھ خاکہ نگاری کے لیے ضروری ہے ۔ دوسرے اس سے تہی ہیں ۔ پھر تم کیوں نہ خاکہ لکھو ؟

پرویز بزمی نے میرے خط کا کیا اثر لیا ؟ ان صاحب نے غزل مرسل کی یا نیا مکتوب ؟

راغب شکیب ان دنوں کہاں ہے ؟ جسارت میں اور امروز میں اب اس کی ڈائری نظر نہیں آئی ۔ راحت شیخی ، پروین عاطف اور الطاف فاطمہ قریب ہوں تو میرا اسلام کہو ۔

کلیان سودا لینے بازار گیا ہوا ہے۔ اگر جلد آگیا تو آج، ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خُدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے!

یکشنبہ، گیارھویں جولائی ۱۹۸۱ء
بمطابق ۸ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ

جواب خط کا طالب
غالب

۱۵

برخوردار،

یہ بات تو کچھ نہیں کہ خط کا جواب نہیں لکھتے، اگر شتاب نہیں لکھتے تو خیر، دیر سے لکھو، تمھارا خط آیا۔ کلیان سنے حقہ تازہ کیا، میں نے پہلے تمھارا خط پڑھا پھر حقےؔ کو منہ لگایا۔ اس کے دوسرے دن چہار شنبہ کے روز بعد دوپہر اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل صاحب مسیح الدّین صدّیقی نے اہلِ قلم کانفرنس اسلام آباد میں شرکت کا دعوت نامہ بھیجا۔ ہر چند میرا رُوئے سخن تمھاری طرف تھا۔ قلم تھامے نامۂ غالب برائے تخلیق لکھنے میں مصروف تھا مگر ترغیب صدّیقی صاحب کے خط میں زیادہ تھی، آنے جانے کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ، قیام و طعام کے لیے ہوٹل اسلام آباد، سو اس طرف توجہ پہلے ہوتی۔ سالِ گذشتہ مجھے اس کانفرنس میں مدعو نہیں کیا گیا تھا میں تو چپ رہا لیکن احباب نے بشمول انتظار حسین، سرور مجاز، اظہر جاوید واویلا کیا۔ اور ڈائرکٹر جنرل صاحب کو یاد دلایا کہ رئیسِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق بالواسطہ طور پر میرا شاگرد ہے۔ کیفیت اس کی یوں ہے کہ ایک تو جرنیل صاحب اپنی تقریروں میں میرے شعر اقتباس کرتے ہیں، دوم اُن کے اُستاد

اشتیاق حسین قریشی میرے شاگردِ معنوی ہیں۔ بلحاظ اس تعلّق کے جنرل ضیاء الحق میرے پوتے شاگرد ہیں۔ ایک اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان میں جتنے سلحشور ہیں مثلاً شفیق الرحمٰن، صدیق سالک، ضمیر جعفری، غلام سرور وغیرہ سب میرے مدّاح ہیں۔ کرنل محمد خاں نے تو میرے دیوان کی نثر "بجنگ آمد" میں شامل کی، گویا حیاتِ جاوید پائی، ان نسبت ہائے لطیفہ کا علم صاحب ڈائرکٹر جنرل کو نہیں تھا، اس لیے میرا نام اکادمی کی لوح سے حذف ہوا لیکن امسال چیرمین اکادمی کے شفیق الرّحمان ہیں، میرا اور ان کا رشتہ مزاح کا بھی ہے۔ امسال دعوت نامہ آ گیا۔ اب میں اس خبط میں مبتلا نہیں کہ

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

بلکہ عدم شرکت کی وجہ زنِ بیوہ اندرا گاندھی ہے۔ میرزا اظہر، سنو، اس نے اعتراض اٹھایا ہے کہ غالبِ خستہ کا داخلہ در پاکستان شملہ معاہدے کے منافی ہے۔ سنا ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو ورودِ پاکستان کی اجازت نہیں ملی اور اسلام آباد میں جمیل جالبی، وزیر آغا، فرمان فتح پوری، جمیل الدّین عالی اور انور سدید نے ان کا انتظار ناحق کیا۔ اے بھائی، میری بات موقوف کرو، پہلے یہ بتاؤ کہ اس کانفرنس میں تم کیوں شریک نہیں ہوئے، حیدر قریشی کا اعتراض بجا کہ فرحت نواز کو نہیں بلایا گیا۔ لیکن شکایت تمھیں کیا پیدا ہوتی ہے؟

میں نے عذرا اصغر سے بلطائفِ حِیل دریافت کیا۔ اس نے لکھا کہ "ہرچند اظہر جاوید شریکِ ادارتِ تخلیق ہیں لیکن کانفرنس میں عدم شرکت کا باعث انھیں بھی معلوم نہیں"۔ سو اس راز سے پردہ نہیں اٹھا۔ ہاں یہ ضرور کہا کہ نواب اصغر مہدی کو دعوت نامہ نہیں ملا۔ اے حضرت! کیا یہ خطرہ تو نہیں تھا کہ امسال ایک لاکھ روپے کا عطیّہ تمھارے نام منسوب ہو گا اور تم بہ وضعداری اس کی تردید نامناسب سمجھو گے۔ سنا ہے کہ حضرت احمد ندیم قاسمی کو بھی یہی خدشہ درپیش تھا لیکن دردِ گردہ نے ان کی بروقت یاوری کی۔ یہ خبر خُلد آباد میں بھی پہنچی کہ عملِ جرّاحی میں پتّے ضرورت قلیل شفائی اپنا خُون دیں گے۔ یہ اعلان اخبار مشرق میں جلی حروف میں چھپا ہے۔ مزید سنا ہے کہ ایسی ہی پیش کش ایک اور ادیب نے

بھی کی لیکن مستجاب نہیں ہوئی۔

میں نے سنا تو دل خوش ہوا کہ انور سدید ادب کے اختلاف کو نزاعِ ذات نہیں بناتا سلیم اختر سے معانقہ کرتا ہے، طاہر تونسوی کو گلے لگاتا ہے، حضرت احمد ندیم قاسمی کا ادب دل وجان سے کرتا ہے۔ اور جو تم بہرِ عیادت ماجرہ میموریل ہسپتال میں جاؤ تو میری طرف سے ان کی مزاج پرسی کرو، کہو کہ غالبِ خستہ آپ کی کالم نگاری کا اور فلیپ نویسی اور دوامِ فن کے لیے آپ کی جہدِ مسلسل کا معترف ہے۔ غزل اور نظم اور افسانے میں ان کے بدخواہ خدماتِ جمیلہ کا اعتراف نہ بھی کریں تو کالم نگاری میں ایک خاص نوع کا مزاج جو طولِ کلام سے پیدا ہوتا ہے انہیں کی ایجاد ہے، اس پر طرّہ ان کی کثرت نگاری ہے، اس میدان میں ان کا کوئی حریف نہیں، واللہ باللہ، فلیپ نگاری میں وہ طرزِ نو کے موجد ہیں، اس منصبِ جلیلہ پر وہ ہمیشہ فائز رہیں گے۔ نیز لکھو کہ گردے میں سے کتنے پتھر نکلے ہیں اور یہ جو تکلیفِ سنگ تھی وہ اب رفع ہو گئی ہے یا نہیں۔ تشویش اس امر میں مجھے بھی بہت ہے اور مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر جو میرے شریکِ عیادت ہیں بہ اصرار دریافت کرتے ہیں۔

یہ اطلاع مجھے عذرا اصغر نے دی کہ اسلام آباد کانفرنس میں خواتین کی تعدادِ کثیر مدعو تھی، لیکن سب کو تمہاری غیر حاضری کھلتی تھی، فائدہ اس کا روزنِ دیوار سے جھانکنے والوں نے اٹھایا۔ محفلِ مقالات میں، اور محفلِ طعام میں اور ہوٹل کے غیر رسمی اجتماع میں جہاں تین چار خواتین پاکستانی ادبا کی گرسنہ نگاہوں سے بچ کر الگ کھڑی ہوتیں، یہ حضرات جا دھمکتے، مولانا نعیم صدیقی نے اس منظر کو بار بار دیکھا اور ہر مرتبہ اسے غیر اسلامی قرار دیا، اس روش کے خلاف آواز اٹھانے کا موقعہ نہیں تھا لیکن اس پر اگر وہ اخبار "جسارت" میں کچھ لکھیں تو کچھ بعید نہیں، اور جو تم شریکِ کانفرنس ہوتے تو یہ کیفیت نہ ہوتی، خواتین طمانیت کا سانس لیتیں، تمہارے زیرِ سایہ کانفرنس میں سرگرم حصّہ لیتیں، اے بھائی، جو اگلے سال یہ کانفرنس ہو تو زنہار انکار نہ کرنا۔

میں نے سنا ہے کہ اہلِ پاکستان نے ۱۹۸۱ء کا سالِ ادب محمد طفیل کے نام معنون کیا ہے۔ اور

جو تاحال نہیں کیا تو میں اس کا اعلان کرتا ہوں۔ تم دریافت کرو کیوں ؟ میں عرض پرداز ہوں کہ مشقت اس عزیز نے ادب کی سال بھر اٹھائی، پہلے اپنے خاکوں کی کتاب "مجتبیٰ" شائع کی۔ دو جلدوں میں "میر تقی میر" نمبر چھاپا۔ ادب کی جملہ معرکہ آرائیوں کی تاریخ مدوّن کی اور وہ بھی دو ضخیم جلدوں میں کہ مجھ سا بوڑھا کھوسٹ اٹھانا چاہے تو اٹھائے نہ بنے اور چھوڑنا چاہے تو طبیعت چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو، اس پر مستزاد میر انیس کے غیر مطبوعہ مرثیوں کی اشاعت۔ پاکستان کے رئیسِ مملکت نے مجلّہ نقوش کی تقریب رُونمائی میں شرکت کی اور ازرہِ کرم گستری ادب نقوش میں لکھنے والوں کے لیے ایوارڈ کا اعلان کیا۔ یہ سب سعادتیں ہیں اور خدائے بخشندہ کی عطا۔ لیکن اس میں محمد طفیل کا زورِ بازو بھی شامل ہے۔ میاں یوں سمجھو کہ جب تک جان جوکھوں کی مشقت نہ اٹھائی جائے خدائے بخشندہ بھی سعادت نہیں بخشتا۔ محمد طفیل نے یہی کیا ہے۔ سالہا سال کام کیا۔ نہ صلے کی تمنا، نہ ستایش کی پروا۔ یہ سب کچھ اب اس کا حق ہے۔ مزید یہ کہ ادارۂ مصنفین جمیل الدین عالی کا بناکردہ ہے لیکن اس کی ترتیب و تدوین میں محمد طفیل کا حصّہ بھی نمایاں ہے۔ اس نے اسے مثلِ نقوش سنوارا ہے۔ کتابت اعلیٰ، طباعت اُجلی، پیشکش کا انداز جُداگانہ، کچھ کم کوش، حیلہ جو، فتنہ پرداز تقسیمِ انعامات کے بہانے اس پر کلوخ اندازی کرتے ہیں تو اسے ان کی نیت کا فتور سمجھو۔

اسے میاں، محمد طفیل کا یہ تذکرہ باموقعہ اور بامحل ہے۔ میں اس کا دیرینہ مدّاح ہوں۔ پاکستان میں غالب کا حقِ ادب سمجھو لیکن ادا کس نے کیا، ڈاکٹر سید عبداللہ نے، محمد حیات خاں سیال نے، اظہر جاوید نے، وزیر آغا نے، اندازِ جداگانہ سے محمد طفیل نے، میں کتابیں کہاں سے چھپواتا، روٹی کھانے کو نہیں۔ شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں۔ لحاف توشک کی فکر ہے۔ کتابیں کیا چھپواؤں گا۔ محمد طفیل نے بلا میری خواہش کے غالب نمبر کی نیو ڈالی۔ ضخیم دو جلدیں مشتمل بہ مقالاتِ تنقید شائع کیں، تیسری جلد میں میرا معدوم دیوان آراستہ کیا، اور اب نقوش ایوارڈ کا اعلان ہوا ہے تو سمجھو اس میں بھی میرا حصّہ ہے۔ میں نقوش کا سب سے پرانا لکھنے والا ہوں اور حفیظ جالندھری کی مثل زندوں میں شمار

نہیں ہوتا۔ نقوش ایوارڈ میرا حق ہے، مجھے ضرور ملے گا۔ اور جو کہو یہ ایوارڈ میرزا غالب کے لیے وضع ہوا ہے تو بھی درست ہے! گلڈ کے انعام پر میری نظر نہیں جاتی، یہ احمد ندیم قاسمی اور میرزا ادیب اور سلیم اختر کو نصیب ہو!

اے میاں، اس موقعہ پر انور سدید کا نام نہ لو، ہر چند اس سے میرا تعلق دیرینہ ہے لیکن اب یہ تعلق خطرے کی زد پر ہے۔ سنو! میں نے جو رقعے تمہارے نام لکھے ہیں ان کا مجموعہ انور سدید نے گذشتہ سال مرتّب کیا تھا۔ ہر چند تم اس پر آمادہ نہیں تھے لیکن میرے اصرار پر تم نے اس کا دیباچہ لکھا۔ میری عزّت افزائی کی۔ کتابت اس کی صغیر احمد خاں شروانی خوش رقم نے کی لیکن اب یہ حضرت طباعت اس کتاب کی میں غیر معمولی تاخیر کا مرتکب ہے اور اشاعت بلا وجہ التوائے طویل میں ڈال رہا ہے۔ سنا ہے کہ اس نے اپنے انشائیوں کی کتاب الموسوم بہ "ذکر اس پری وش کا" چھپوالی ہے۔ نام اس کتاب کا میری غزل سے ماخوذ ہے لیکن بخدا میں معترض نہیں۔ فیض نے بھی اس جرم کا ارتکاب دانستہ اور بتکرار کیا ہے، میں نے اعتراض نہیں اٹھایا، پھر انور سدید پر اعتراض کیوں؟ ہاں اشاعتِ خطوط کے تغافل کو نظر انداز کیسے کروں؟ اور جو مزید تاخیر کا خدشہ ہو تو مسوّدہ مرقومہ مجھے بھجوا دو، آگرے میں میرا شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ ہے، اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمّے لیا ہے اور ساحل احمد کے ادارے سے چھپوانے کا ارادہ کیا ہے اور جو تم اور وزیر آغا مل کر انور سدید کو سمجھاؤ اور بہ تعجیل آمادۂ اشاعتِ کتاب ہو تو پھر اس تردّد کی چنداں ضرورت نہیں۔

اے میاں، کتاب کے چھپنے سے جو خوشی ہوتی ہے فی الوقت انور سدید اس خوشی کو ہماری قسمت سے خارج کرنے پر آمادہ ہے۔ اور جو اس کی کوئی وجہ نفسیاتی ہو تو سلیم اختر سے پوچھ کر بتاؤ؟ زبان پہ بارِ سے یہ کس کا نام آیا۔ آپ کے اور عذرا اصغر کے مجلّہ "تخلیق" میں ستّار طاہر کا مضمون "ادب کے فٹ نوٹس" الطاف حسین حالی سے پڑھوا کر سنا، اور اس سے عبرت حاصل کی، اگر مجھے قوّتِ ناظمہ پر اب تصرّفِ حاصل ہوتا تو ستّار طاہر کی تعریف میں ایک قطعہ لکھتا، مجھے بتاؤ کہ حریفوں نے اس کے خلاف تھانے میں رپٹ لکھوائی ہے؟ تیغ دشنام عریاں کی ہے؟ اب اس نے امروز میں ایک اور جال پھینکا ہے حلقۂ دامِ خیال میں

نفسیاتی تنقید کے علمبرداروں کو پھانسا اور سوال اٹھایا کہ یہ لوگ اپنی تحریروں سے اور آرا سے جس
طرح انحراف کرتے ہیں اس کے حوالے سے اپنا نفسیاتی تجزیہ قارئین کے سامنے کیوں پیش نہیں
کرتے۔ اے بھائی، ستار طاہر نے نام نہیں لیا لیکن بلاریب روئے سخن ڈاکٹر سلیم اختر کی طرف
ہے۔ پاکستان میں اور کسی نے نقاد نے اپنی رائے نہیں بدلی۔ کیا اس کے پیچھے بھی عمل کسی ذہنی
کجروی کا ہے؟ اور کیا تم نے کوبراج ہرنام داس سے اس باب میں مشورہ کیا ہے؟

اخبار" جنگ" میں میر جملہ لاہوری نے پیش گوئی کی ہے کہ ۱۹۸۲ء میں سلیم اختر کے تعلقات
تخلیق سے اور میرزا اظہر جاوید سے استوار ہو جائیں گے اور وہ عذرا اصغر کی افسانہ نگاری پر مضمون
لکھ کر فنون کو بھیجیں گے۔ لیکن فنون راغب شکیب کے رسالہ اُردو زبان میں سلیم اختر کے خط کی
اشاعت کے بعد اس مضمون کو چھاپنے سے انکار کر دے گا۔ سائرہ ہاشمی چائے کی ایک رسمی
دعوت میں سلیم اختر کو مدعو کرنا بھول جائیں گی، اس پر ناراض ہو کر وہ "ریت کی دیوار" سے اپنا
دیباچہ واپس لے لیں گے اور مختصر ترین تاریخ ادب اُردو کے نویں ایڈیشن سے سائرہ ہاشمی
کا نام خارج کر کے اس کی جگہ عذرا اصغر کا نام درج کریں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔
اے میاں، جو تم سائرہ ہاشمی کی جگہ میرا نام درج کرا سکو تو میں تمہارا شکرگذار رہوں گا۔ اس
امر میں یہ احتیاط لازم ہے کہ عذرا اصغر کو یہ خبر قبل از اشاعت نہ ہو۔

راغب شکیب نے مجھے اخبار جنگ کے تین پرچے بھجواتے ہیں۔ تنویر ظہور نے اور حسن
رضوی نے اس میں عجب بہار پیدا کی ہے۔ ایک پرچے میں احوال عذرا اصغر کا تھا ساتھ تصویر
مشتہر تھی۔ "جنگ" نے گویا لاہور میں آتے ہی گھمسان کا رن ڈال دیا ہے۔ وہ حورانِ ارضی جو
بقول حفیظ جالندھری "پردے کی تھیں آبادیاں" اور "چشمِ فلک نے آج تک" دیکھی نہ تھی جن کی
جھلک" اب اخبار کے صفحے پر برسرِ عام روئے زیبا دکھاتی ہیں، یہ انداز اخبار" جنگ" نے عام
کیا ہے۔ اور اب نوائے وقت بھی اس روش پر چل نکلا ہے۔ "جنگ" کے صفحۂ ادب پر
میر جملہ لاہوری کی پھبتی نے سر اُبھارا ہے، نوائے وقت میں جواباً ڈبل ایم اے صاحب
بے پر کی اڑا رہے ہیں۔ مزاح شخصی ہے لیکن عالم یہ کہ پھبتی اور ضلع جگت سے جو اہانت ہوتی
ہے اس کی زد میں میر جملہ لاہوری اور ڈبل ایم اے صاحب ہی آتے ہیں اور جب تک مقام

مسکراہٹ کا بنایا نہ جائے قہقہہ بیدار نہیں ہوتا۔ سنا ہے کہ اس نفسانفسی کے عالم میں امروز نے اپنی وضع نہیں بدلی۔ اور قسمت علمی و ادبی کے معیارِ سابقہ کو برقرار رکھا ہے۔ البتہ سلمان بٹ چٹان پر کھڑا ہو کر بھاری بھر کم مزاح نگاروں کی خفیف الحرکتی پر خندہ زن ہے۔ سنا ہے کہ ماہ نامہ "اُردو زبان" نے پاکستانی ادب کے اِس دور کو مصحفی اور انشا کے دور سے تعبیر کیا ہے اور ایک باب "لاہوری ادب" کے نام سے باندھا ہے جس میں ہجو اور پھبتی اور ضلع جگت جو لاہور میں پرورش پا رہی ہے سب جمع کی ہے۔ نیز انتظار حسین نے لکھا ہے کہ پاکستانی ادیب شہرت کے پیچھے فلم ایکٹر کی طرح دیوانہ وار بھاگ رہا ہے۔ ادب کم تخلیق کرتا ہے، تصویر کی اشاعت پر اصرار زیادہ کرتا ہے۔ اس باب میں ایک بات اور ہے اور وہ محلِ غور ہے۔ اپنی کتاب کی پشت پر سلیم اختر نے پورے صفحے کی تصویر چھاپی تھی تو یہ اس کے مزاج کی نرگسیت کا حصّہ تھا۔ کیا اس کی تقلید ضروری تھی کہ اب ہر ادیب اپنی تصویر کو اہمیت دے رہا ہے۔ کیا پاکستان کے سب ادیب نرگسیت کا شکار ہیں؟

ہائے، خاور رضوی اور منظور عارف کیا جوان مارے گئے، یہ بھی انھیں میں سے ہیں جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزار ہا دوست مر گئے، کس کو یاد کروں۔ کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غم خوار نہیں، مروں تو کوئی عزادار نہیں۔ مجھے منظور عارف کا غمِ مرگ بھی ہے۔ اور اس بات کا صدمہ بھی کہ دیوان اس کا مرتب ہوا لیکن شائع نہیں ہوا۔ سنا ہے کہ مکتبۂ فنون میں عرصے تک پڑا رہا۔ اب اس کی تقریب رونمائی ہونے والی تھی لیکن منظور عارف نے اس روسیاہی کو قبول نہ کیا اور دنیا سے منہ موڑ لیا۔ جمیل ملک نے مضمون اس کی شاعری پر لکھا، اچھا کیا، گھر بلا کر سنایا، اور بھی اچھا کیا۔ منظور عارف کے چہرے پر جو طمانیت بعد از مرگ تھی بلاشبہ اسی مضمون کے باعث تھی۔ خاور رضوی ان آلائشوں سے پاک تھے۔ غزل کہتے تھے اور پرویز بزمی کو سنا کر خوش ہوتے تھے۔ لاہور میں حلقۂ اربابِ ذوق نے جو تعزیتی جلسہ کیا اس میں مرحوم کو جاننے والا کوئی نہ تھا۔ کچھ باتیں احسان اکبر نے کیں جو خوش قسمتی سے وہاں آ گئے تھے۔ اللہ باقی ہوس! تم نے سنا فضل احمد کریم

فضلی بھی دنیا سے منہ موڑ گئے، ہائے، مرحوم اُردو کے سالک تھے گویا اس زبان کے مالک تھے۔ علی گڑھ سے شہپر رسول نے اور سری نگر سے مظہر امام نے تمہارے نام میرے خطوط پر جملہ ہائے تحسین لکھے ہیں، یہ تعریف بالواسطہ "تخلیق" کی ہے میں اسے قبول کرتا ہوں اور تم تک اور عذرا اصغر تک پہنچاتا ہوں۔

حضرت! یہاں مشہور ہے کہ میرزا ادیب نے اپنی آپ بیتی "مٹی کا دیا" چھاپ دی ہے۔ گویا زندگی کی گرہ نیم باز کا قرض اپنے ناخن سے اتار دیا ہے۔ مزید مشہور ہے کہ عہدِ آئندہ کے ادب کی تاریخ اسی کتاب سے مرتب ہوگی، میں نے یہ کتاب نہیں دیکھی۔ میرزا صاحب نے ایک نسخے پر میرا نام لکھا تھا لیکن پھر اسے مٹا دیا اور کتاب کسی مہ جبین کی نذر کر دی، یہ اطلاع مجھے حیدر قریشی نے خان پور سے دی ہے۔ بھلا بتاؤ تو میرزا ادیب کی بیگم کو فوت ہوئے کے دن ہوئے ہیں۔ اور جو یہ کتاب آپ کو تخلیق میں تبصرے کے لیے موصول ہوئی ہو تو مجھے بھیجو۔

مشفق خواجہ کا تخلیقی ادب کب شائع ہوگا؟ اور اب جو مجلہ شائع ہوگا وہ ۱۹۸۱ء کا شمار ہوگا یا ۱۹۸۲ء کا۔ مجھے ایک نسخہ صادق الخیری کی کتاب "آسماں کیسے کیسے" کا ملا ہے۔ اسلام آباد سے صدیق سالک نے تادم تحریر بھجوائی ہے۔ ایک مسودہ کراچی سے کرار نوری کا بوساطت نسیم دُرّانی اور دوسرا صبا اکبر آبادی کا بوسیلہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری آیا ہے۔ تقاضا ان پر تقریظ لکھنے کا ہے۔ حضرات کو پتہ نہیں کہ میں زندہ ہوں لیکن نیم مردہ، آٹھ پہر پڑا رہتا ہوں۔ اصل صاحبِ فراش میں ہوں۔ دردِ مخلِّل رُوح ہے۔ ہر روز مرگِ نو کا مزا چکھتا ہوں، حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں۔ پھر میں کیوں جیتا ہوں، روح میری اب جسم میں اسطرح گھبراتی ہے جسطرح طائر قفس میں۔ شغل، اختلاط، جلسہ، مجمع سب مرغوبِ خاطر ہیں لیکن ایک ذیرانی سی دل پر مرقوم ہے جسے رفع کرنے کے لیے تمھیں خط لکھتا ہوں۔ میں نے سب کتابیں پانی پت کے نکتہ داں الطاف حسین کو حالی کو دی ہیں وہ ان پر تبصرہ لکھیں گے، تم انھیں تخلیق میں چھاپو گے، میں ان محبتوں کے سامنے سرخرو ہوں گا۔

۷ جنوری ۱۹۸۲ء — اسد اللہ غالب، بے دست گاہ

نظر بہ احتیاط یہ خط بیرنگ بھیجا ہے قصور معاف۔

کرنل محمد خان کا خط چچا غالب کے نام

غالب چچا!

آداب۔ ایک مہندس، کہ نام اس نیک بخت کا انور سدید ہے، تمہارے نام سے لوگوں کو خط لکھ رہا ہے۔ ہو بہو، اسی طرح جیسے تم اپنے دوستوں کو لکھا کرتے تھے، لکھتا کہاں ہے، مکتوب الیہ کے ساتھ بالکل تمہاری طرح باتیں کرتا معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہی آداب استعمال کرتا ہے جیسے تمہارے خطوں میں ہیں، وہی روزمرہ، وہی شوخیاں۔

چچا۔ اس شخص انور سدید کی مشابہت — چہرے کی نہیں، تحریر کی — تم سے اس قدر مکمل ہے کہ اس کا کوئی خط پڑھ لو، تمہیں شبہ ہوگا یہ تو میں نے لکھا ہے۔ بلکہ سچی بات ہے چچا، اس کے بعض خطوط تو اس قدر شوخ اور دلربا ہیں کہ خود تمہیں پڑھ کر فخر محسوس ہوگا۔

چچا۔ تمہارے جانے کے بعد اردو شعر و ادب میں بے مثال ترقی ہوئی ہے۔ لیکن شاعری میں تمہارے رنگ کو آج تک کوئی نہیں پہنچا۔ تمہاری نثر بھی آج تک ناقابلِ تقلید تھی لیکن انور سدید کی کوشش کے بعد اب یہ قسم نہیں کھائی جاتی۔

سمجھ نہیں آتی، چچا، کہ اس کارنامے پر شاباش تمہیں دینا چاہیے یا انور سدید کو، بے شک تم استاد ہو اور انور سدید تمہارا پیرو، مگر شاباش کے مستحق تم دونوں برابر کے نظر آتے ہو۔

راولپنڈی

——— محمد خان

۴ مارچ ۱۹۸۲ء

کچھ اس کتاب کے بارے میں

تنقید، تحقیق، انشائیہ، طنز و مزاح، یہاں تک کہ شاعری بھی ــــ آخر کون سی صنفِ ادب ہے جس میں انور سدید کے کمالات کا اظہار نہ ہوا ہو۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ انور سدید ایک فرد کا نام نہیں کئی افراد کا "مجموعی نام" ہے جو ادب کے الگ الگ شعبوں میں سرگرمِ عمل ہیں اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ۔

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے سامنے ہے، ادبی طنز و مزاح کا بہترین نمونہ ہے۔ میں نے "ادبی طنز و مزاح" اس لیے کہا ہے کہ اس کتاب کا سارا مواد ادبی مسائل و معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے ادبی ڈائری بھی کہا جا سکتا ہے۔ جس میں شگفتہ اور باغ و بہار انداز میں ہم عصر ادب کے بعض پہلوؤں کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے اور اس طرح کہ ادب ہی کی نہیں، ادیبوں کی رفتار کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔

ان خطوں میں جگہ جگہ ادبی شخصیات کا ذکر ہے، اور انداز وہی غالب والا ہے کہ چھیڑ خوباں سے چلی جائے ...... غالب تو خیر اس سے آگے بھی بڑھ جاتے تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے "پیش دستی" کا اعتراف بھی کیا ہے۔ لیکن انور سدید کے ہاں معاملہ چھیڑ چھاڑ تک ہی رہتا ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ یہی وجہ ہے کہ پوری کتاب میں کہیں تلخی یا تلخ بیانی نظر نہیں آتی۔ انور سدید کی چھیڑ چھاڑ چونکہ نیک نیتی پر مبنی ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ بھی اس کتاب سے محظوظ ہوں گے جن کا ذکر اس میں باندازِ دگر آیا ہے۔

انور سدید نے اظہارِ مطالب کے لیے غالب کے خطوط کا پیرایہ اختیار کیا ہے، غالب کے انداز کو اختیار کرنے میں وہ اس حد تک کامیاب ہوئے ہیں کہ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں "ماہرینِ غالبیات" ان خطوں کو اصلی سمجھ کر غالب پر مزید تحقیق کا آغاز نہ کر دیں۔

مشفق خواجہ

کراچی

۱۸ فروری ۱۹۸۲ء

Scanned by CamScanner